خواتین کا ترجمان
357
رضوان
لکھنؤ
ماہنامہ
شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نمبر

بانی مولانا محمد ثانی حسنیؒ و امۃ اللہ تسنیمؒ

خواتین
کا
دینی
ترجماں

ماہنامہ رضوان لکھنؤ

جلد ۲۶ | جون و جولائی ۱۹۸۲ء مطابق رمضان المبارک و شوال ۱۴۰۲ھ | نمبر ۶-۷

مدیر

محمد حمزہ حسنی

معاونین

امامہ حسنی　　میمونہ حسنی

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نمبر

اس شمارے کی قیمت .. .. تین روپے
سالانہ چندہ .. .. بارہ روپے
دفتر ماہنامہ رضوان، ۳ گوئن روڈ لکھنؤ (یوپی) ۱۸

کیا اور کہاں

اداریہ

مولانا محمد رابع ندوی

یوم دوشنبہ یکم شعبان بعد نماز عصر مدینہ منورہ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی اپنے پروردگار سے جا ملے اور اس طرح اپنی دیرینہ تمنا کے مطابق اس دنیا سے رخصت ہونے پر گہوارہ صحابہ و اولیاء قبرستان شہر نبوی بقیع شریف کے پیوند خاک ہوئے اس کے لیے حضرت شیخ نے برسوں سے تیاری کر رکھی تھی اور ہندستان سے ہجرت کر کے مدنی وطنیت حاصل کی تھی اور مسجد نبوی شریف کے جوار میں علالت و صحت کے ساتھ عبادت و حاضری مسجد نبوی میں وقت گذارتے تھے۔

حضرت شیخ نے اپنی تمنا پوری کی اور اس دن وفات پائی جو دن ان کے اور ہم سب کے آقا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا دن ہے۔ اور اس طرح اپنی محبت و رسول کی قبولیت کا ایک اشارہ بھی حاصل کر لیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے یہاں ان کے درجات مقبولیت زیادہ سے زیادہ بڑھائے اور بلند سے بلند مقام رضا عطا فرمائے۔

حضرت شیخ کی رحلت سے بزرگوں اور علماء اعلام کا وہ عہد ختم ہو گیا جو بانی تبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مجاہد کبیر شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ اور ولی کامل حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ

سے مزین اور آراستہ تھا۔ یہ ایک عظیم داعی، عالم، مربی، مجاہد طبقہ تھا۔ جو ملت اسلامیہ کا اس دنیا میں سہارا تھا۔ کتنے طوفانوں اور فتنوں میں ڈھال بنتا تھا اور مسلمانوں کی قومی اور مذہبی زندگی میں رہنمائی کا فریضہ پورا کرتا تھا، یہ ایک چھتری تھی جس میں کم از کم برصغیر ہند و پاک کے مسلمان اپنی مذہبی، علمی اور دعوتی پریشانیوں میں سایہ حاصل کرتے تھے، زعماء دین کی اس اولین صف کے افراد ایک ایک کر کے اٹھتے گئے اور بالآخر اس صف کے آخری فرد حضرت شیخ بھی اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔

حضرت شیخ نے عمر کی ۸۰ سے زیادہ منزلیں طے کیں۔ لیکن وہ ملت کی تربیت و رہنمائی سے ایک گھڑی کے لئے نہ تھکے اور نہ سست پڑے، شدید علالت میں بھی ہزاروں وابستگان تربیت کی رہنمائی اور فکر کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایک غیر معمولی علمی شخصیت کی حیثیت سے برابر ادائیگی فرض کرتے رہے۔ جامعہ مظاہر علوم میں حدیث شریف کا درس بڑے معیاری طریقہ سے انجام دیتے رہے۔ اور درس کی جامعیت اور شہرت کی وجہ سے نہ صرف جامعہ مظاہر علوم بلکہ پورے ہند و پاک میں اسی نسبت سے معروف ہوئے۔ اور شیخ الحدیث کا لقب ان کا اصلی لقب بن گیا۔ درس حدیث کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی ایسے بڑے پیمانے پر انجام دیتے رہے کہ حدیث میں تصنیفی کام کی تعداد و اہمیت میں منفرد مقام حاصل کیا۔ علم حدیث کے دائرہ میں تصنیفی کام کے ساتھ ساتھ تبلیغی میدان میں بھی ان کی تصنیفات کو وہ مقبولیت و عمومیت حاصل ہوئی کہ اس موضوع کی دیگر کتابوں کو کم حاصل ہوئی ہوگی۔ ان کی فضائل کی کتابوں کو آج شہرہ آفاق مقام حاصل ہے۔ جو اب ایک مجموعہ کی شکل میں تبلیغی نصاب کے نام سے معروف ہوا۔

حضرت شیخ کاندھلہ کے ایک معزز خاندان کے فرد تھے ان کے خاندان کی وہ شاخ جس میں وہ ہی دین و علم دین میں خصوصی مقام کی حامل رہی ان میں ان کے دادا مولانا محمد اسمٰعیل صاحبؒ ان کے والد مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ ان کے چچا مولانا محمد الیاس صاحبؒ، ان کے چچازاد بھائی مولانا محمد یوسف صاحبؒ سب دعوت و علم دین کے آفتاب و مہتاب تھے۔

حضرت شیخ نے اپنے عظیم والد حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی سے خصوصی تربیت حاصل کی۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری سے وابستہ ہوئے اور ان کی تربیت و علمی خصوصیات سے ایسا استفادہ کیا اور ان کے اعتماد کو حاصل کیا کہ ان کے بعد ان کے جانشین و نائب ہوئے خدمت حدیث میں ان کے کام کی تکمیل کی اور ان کے بعد اس کا سلسلہ جاری رکھا، سنن ابی داؤد کی شرح بذل المجہود کی تکمیل میں ان کا پورا ہاتھ بٹایا۔ اور پھر اس کی اشاعت کے کام کو انجام دیا۔ بخاری شریف کے مختلف پہلوؤں پر اپنی قیمتی علمی کاوشیں پیش کیں۔ نیز عمرات النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک بڑی تحقیقی کتاب لکھی۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے تربیت باطنی کا کام بہت بڑے پیمانے پر انجام دیا اور ہزاروں لاکھوں متوسلین کے مرجع بنے، ان کے ساتھ رمضان المبارک کی ساعات کو عبدیت و عبادت میں گذارنے کے لئے ان کی اعتکاف گاہ مسجد میں سیکڑوں آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ جو ان کے ساتھ مہینہ مہینہ بھر کا اعتکاف کرتے اور اپنی روح باطن کو عبدیت کی کیفیات سے آراستہ کرتے، یہ سلسلہ گذشتہ رمضان تک جاری رہا۔

غیر رمضان میں بھی ان کی قیام گاہ پر طالبین اصلاح باطن کا مجمع رہتا اور وہ ان سب کی مہمان نوازی کرتے اور ان کی دینی اصلاح و مدد کا باعث بنتے۔

اتباع رسول دین کو دنیا پر اور اپنی خواہش و آرام پر ترجیح دینے میں مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ سلف صالحین کے جو واقعات کتابوں میں ملتے ہیں ان کا نمونہ ان کی زندگی میں نمایاں طریقہ سے نظر آتا تھا، اخلاق، اکرام مسلم، ضیافت، دین کی حمیت، مسلمانوں کی اور اسلام کی سربلندی کی فکر، اتحاد بین المسلمین کے لیے کوشش، وسعت قلبی، بلند نظری، ذکاوت و فہم دین اور نہ معلوم کتنی ایسی صفات تھیں جو ان میں نگینوں کی طرح نظر آتی تھیں اور مخلوق خدا ان کی وجہ سے ان کی طرف کھنچتی اور ان سے وابستہ ہوتی تھی۔

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو مدارس کے بقاء و ترقی اور علم دین کی ترویج سے غیر معمولی دل چسپی تھی، مظاہر علوم کی خدمت و ترقی کے لیے تو انھوں نے اپنی توانائیاں اور اثر و نفوذ کو خوب خوب استعمال کیا۔ دار العلوم دیوبند سے بہت قریبی تعلق تھا لیکن ان کے علاوہ بھی بے شمار مدرسوں کی ترقی سے دل چسپی تھی۔ دار العلوم ندوۃ العلماء سے، ندوۃ العلماء کے ناظم مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے تعلق سے ربط بڑھا اور تعلق میں اضافہ ہوا۔ یہ تعلق بعض وقت بہت غیر معمولی صورت اختیار کر لیتا۔ وہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے خیر و ترقی کے لئے ایسی دل چسپی اور شفقت سے کام لیتے جو صرف اس کے سرپرستوں سے ہی متوقع ہو سکتی ہے۔ وہ اس کے لئے اپنے قیمتی مشوروں، خبر گیری اور تعاون سے نوازتے، ان کے اس تعلق و خبر گیری نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ و طلبا کے دلوں میں حضرت شیخ کے لئے بے حد جذبہ قدر و تشکر پیدا کیا وہ ان کو اپنا ایک عظیم سرپرست سمجھتے تھے۔ ان کی وفات کے سانحہ کو اس وجہ سے بھی دار العلوم ندوۃ العلماء میں بڑا سانحہ سمجھا گیا۔

ادھر کئی سال سے صحت کی معذوریوں اور علالتوں سے بالکل گھر گئے تھے۔ خود سے اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور تھے لیکن اس کے باوجود تربیتی ضرورت کے لئے مدینہ منورہ سے ہندستان، ہندستان سے مدینہ منورہ آنے جانے میں تکلف نہ کرتے

خواہ اس میں کتنی ہی زحمت ہوتی۔ اس سلسلے میں ان کا آخری سفر ہندستان ایک غیر معمولی سفر تھا۔ جس کو انھوں نے صحت کی انتہائی آخری درجہ کی معذوری کے باوجود اختیار کیا اور تکلیف اٹھائی۔

حضرت شیخ کی وفات سے پورا عالم اسلام اور خاص طور پر برصغیر ایک نہایت عظیم اور مذہبی و علمی شخصیت سے محروم ہو گیا۔ اور ملت کی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا جس کو ایک آدمی تو کیا شاید کئی آدمی مل کر بھی عرصہ دراز تک پر نہ کر سکیں گے۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت کے پس ماندگان

حضرت کے پسماندگان میں حضرت کی کئی صاحبزادیاں ہیں۔ اور مولانا محمد طلحہ صاحب ایک صاحبزادے۔ مولانا محمد طلحہ صاحب کو حضرت شیخ نے نہایت حکیمانہ انداز سے تربیت دی ہے کہ وہ بڑی حد تک حضرت کے مطمح نظر کے مطابق اور دینی لحاظ سے معیاری صفات کے حامل ہیں۔ وہ حضرت کی سب سے خورد اولاد ہونے کے باعث ابھی بالکل نوجوان ہیں۔

حضرت مولانا انعام الحسن کاندھلوی امیر تبلیغ حضرت کے داماد ہیں۔ حضرت شیخ کے بعد حضرت کے خاندان کے اب وہی سب سے بڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کی حفاظت فرمائے اور ان کے برکات کا فائدہ زیادہ سے زیادہ دیرپا اور عام فرمائے۔ آمین۔

حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

یہ مضمون مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے حضرت شیخؒ کی زندگی میں لکھا تھا اور یہ مولانا محمد ثانی حسنیؒ کی تصنیف کردہ کتاب "سوانح مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی" میں شائع ہوا۔ چونکہ اس پر حضرت شیخ کی نظر پڑ چکی ہے اس لئے یہ ایک سند کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو من وعن شائع کیا جاتا ہے۔

محمد حمزہ حسنی

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

حضرت شیخ الحدیث
مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہ

از حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ

ولادت وطفولیت

مولانا محمد یحییٰ صاحب کی شادی مولوی یوسف صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی تھی، حضرت شیخ الحدیث ھ ۱۳۱۵ میں رمضان کی گیارھویں شب میں اا بجے رات کو اپنے آبائی مکان واقع کاندھلہ میں پیدا ہوئے۔ ولادت کی تو یدلی تو خاندانی مسجد میں خاندان کے شرفاء و بزرگ اور اہل محلہ تراویح سے فارغ ہو رہے تھے۔ اس لئے بجائے اپنے اپنے گھر جانے کے پہلے اس مکان پر آئے جہاں اس مبارک بچے کی ولادت ہوئی تھی۔ بچہ کی ولادت پر مبارک بادپیش کی۔ پھر اپنے اپنے گھر واپس گئے۔

بچہ کے دادا حضرت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب نظام الدین دہلی میں تھے، پوتے کی پیدائش کی خبر سنی تو برجستہ زبان سے نکلا کہ "ہمارا بدل آگیا" اور ماہ شوال میں دنیا سے رحلت فرمائی۔

ساتویں روز آپ کے والد مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلہ تشریف لائے۔ گھر پہونچ کر بچہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اس زمانہ قدیم میں خاندانوں میں بڑی حیا اور حجاب تھا۔ باپ بزرگوں کے سامنے بچوں کو لینے اور ان سے اظہار تعلق کرنے میں بڑا

حجاب محسوس کرتے تھے اور اس کا دستور نہیں تھا کہ اس طرح بچے کو دیکھنے کے لئے بلایا جائے، وہاں گھر میں عقیقہ کے لئے کچھ نہ کچھ اہتمام ہونا ضروری تھا۔ خاص طور پر رشتہ کی ایک نانی نے جن کا نام بی بی مریم تھا۔ بچہ کے عقیقہ کے لئے بڑا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ اور ان کو اپنے دل کے ارمان نکالنے کی بڑی خوشی تھی۔ مولانا یحییٰ صاحب کے اچانک پہونچنے اور بچہ کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کرنے سے بیبیوں کو ایک گونہ حیرت، اور ایک گونہ مسرت ہوئی اور بعض نے یہ کہہ کر اپنی حیرت دور کی کہ آخر باپ ہیں اگر دیکھنے کو جی چاہا تو کیا بے جا ہے؟ مولانا حجام اپنے ساتھ لائے تھے۔ بچہ آیا تو حجام کو اشارہ کیا، اس نے بال تراش لئے، مولانا نے بال والدہ کے پاس بھجوا دیئے اور فرمایا کہ بال میں نے بنوا دیے، بکرے آپ ذبح کروا دیجئے اور بال کے وزن بھر چاندی صدقہ کر دیجئے۔

بچہ کے دو نام رکھے گئے، محمد موسیٰ، محمد زکریا۔ اسی دوسرے نام نے شہرت عام پائی۔ آپ اسی سے مشہور و مقبول عوام و خواص ہوئے۔

اس وقت مولانا محمد یحییٰ صاحب کا قیام حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رح کی خدمت میں مستقل طور پر گنگوہ رہا کرتا تھا۔ ضرورتاً کاندھلہ اور دہلی آتے جاتے۔ شیخ الحدیث کی عمر ڈھائی سال کی تھی۔ کہ وہ بھی اپنی والدہ صاحبہ کے ساتھ گنگوہ چلے گئے۔ مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کے ساتھ حضرت کا جو سرپرستانہ، مربیانہ بلکہ پدرانہ تعلق تھا[1] اس کی بنا پر اس خوش نصیب و اقبال مند بچہ کو جس کے لئے مستقبل میں حضرت کے کمالات باطنی کا حامل و امین، اور آپ کے علوم ظاہری کا ناشر اور شارح بننا مقدر تھا، آپ کی خصوصی شفقتوں، محبت کی نگاہوں اور مقبول دعاؤں کا جو حصہ

---

[1] اس کی تفصیل مولانا محمد یحییٰ صاحب کے حالات میں گزر چکی ہے۔

ملا ہو، وہ ہر طرح قرین قیاس ہے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ میں ابھی ڈھائی سال ہی کا تھا حضرت گولر کے درخت کے نیچے چار زانو بیٹھے ہوتے تھے، میں حضرت کے پیر دل پکڑا ہو کر حضرت سے خوب لپٹتا، فرماتے تھے کہ جب میں کچھ اور بڑا ہو گیا، راستہ میں کھڑا ہو جاتا، جب حضرت سامنے سے گزرتے تو میں بڑی "قرأت" سے اور بلند آواز کے ساتھ کہتا "السلام علیکم" حضرت بھی از راہ محبت اور شفقت اسی لہجہ اور آواز میں جواب مرحمت فرماتے۔

اس وقت گنگوہ صلحاء و علماء کا مرکز بنا ہوا تھا۔ حضرت کی تربیت باطنی اور شہرۂ آفاق درس حدیث نے طالبین، صادقین اور علمائے کاملین کو دور دور سے کھینچ کھینچ کر اس قصبہ میں جمع کر رکھا تھا۔ اور وہاں ایک ایسی روحانی و علمی فضا در و دیوار پر چھائی ہوئی تھی۔ جس کی نظیر اس مبارک عصر میں بھی دور دور ملنی مشکل تھی[1] شیخ کے بالکل بچپن کا وہ زمانہ جو غیر شعوری طریقہ پر اچھے بُرے اثرات کے جذب کرنے اور ابتدائی نقوش کے مرتسم ہونے کا زمانہ ہے۔ اسی مبارک ماحول میں گزرا، وہ بارہ سال کی عمر تک گنگوہ رہے۔ اس عمر تک ان کا زیادہ تر وقت گنگوہ ہی میں گزرا۔ جب کبھی کسی تقریب میں شرکت کی غرض سے یا کسی ضرورت کے تحت والدہ صاحبہ کا عارضی طور پر کاندھلہ جانا ہوتا، تو وہ بھی جاتے، پھر گنگوہ واپسی ہو جاتی۔ خود ان کا وطن کاندھلہ ایک بڑا دینی و علمی مرکز تھا۔ جس میں گھر کے اندر و باہر عبادت کا ذوق، نوافل و تلاوت کا اہتمام، اہل اللہ اور مردان خدا سے وابستگی و شیفتگی، درس و مطالعہ کا انہماک، تہذیب و متانت اور وضعداری و سنجیدگی کی فضا، بلند ہمتی و جفاکشی ہوا و فضا میں رچی بسی ہوئی تھی۔ اور اس نے اس ہونہار بچہ کے حساس اور بیدار دل و

[1] گنگوہ کے اس دور کا کسی قدر تفصیلی نقشہ "تذکرۃ الرشید" اور حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی سوانح میں ملاحظہ ہو۔

دماغ کا متاثر ہونا بالکل قدرتی تھا۔ گنگوہ سے کاندھلہ جاتے ہوئے اکثر کیرانہ اور تھانہ بھون جہاں سے خاندان کے دیرینہ تعلقات تھے اور مولانا محمد یحییٰ صاحب کے بعض بے تکلف و مخلص احباب، ہم درس اور ہم عمر موجود تھے، کئی کئی روز قیام رہتا۔ کبھی کبھی بڑوت کے راستے سے جہاں خاندانی قرابتیں بھی تھیں اور بعض عزیز قریب اور ہم مذاق لوگ موجود تھے۔ جانا ہوتا۔ یہاں بھی کئی کئی دن بڑی یادگار صحبتیں رہتیں، یاران بزم اور رشتہ کا، محفل، سب بڑے مخلص، باوقار باوضع و باکمال لوگ تھے جن میں ہر ایک اپنے اپنے فن میں کامل تھا۔ کبھی کبھی ان درمیانی منزلوں میں چار چار پانچ پانچ دن لگ جاتے، شیخ بڑی دلچسپی اور لطف کے ساتھ گنگوہ، کاندھلہ اور رائے پور کے مقامات اور منزلوں کے واقعات سناتے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظہ کے ساتھ ان کی قوت مشاہدہ کتنی تیز ہے۔ اور ان مشاہدات اور گزشتہ صحبتوں نے ان کی سیرت اور ذوق کی تشکیل میں کتنا حصہ لیا ہے[1]

شیخ آٹھ سال کے تھے کہ ۲۴ر جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ کو حضرت گنگوہی نے

---

[1] اس زمانہ کے بزرگ بچوں کی اخلاقی تربیت اور ان کے خاص طرح کے ذہنی نشو و نما کے لیے بعض ایسے طریقے اختیار کرتے تھے جن پر آجکل کے ماہرین نفسیات اور ماہرین تعلیم و بچہ بچہ کے ہر طرح کی خواہشات کی تکمیل اور اس کو مکمل آزادی دینے کی بنا پر تنقید کرتے رہتے ہیں، اچھے یا برے جیسے بھی ہوں گے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد یحییٰ صاحب کو خاص طور پر اس کا اہتمام تھا۔ شیخ نے سنایا کہ ایک مرتبہ والد صاحب نے کاندھلہ بھیجنے کا وعدہ فرمایا، میں خوشی کے مارے پھولا نہیں سماتا تھا، وہاں جانے کے لیے دن گننے لگا اور عید کے چاند کی طرح اس کا انتظار کرنے لگا، چند دن کے بعد والد صاحب نے یہ ارادہ ملتوی فرما دیا مجھے اس پر تعجب بھی ہوا اور ملال بھی، ایک روز فرمایا کہ تجھے کاندھلہ جانے کی بے حد خوشی تھی اور تجھ پر اس کا شوق اتنا غالب آ گیا کہ میں نے اسی وجہ سے اس کو ملتوی کر دیا کہ اس پر اتنا خوش ہونا اور اس کا اتنا شوق و ارمان ٹھیک نہیں۔

وفات پائی اور وہ آفتاب رشد و ارشاد غروب ہوا۔ جس نے گنگوہ کی سرزمین کو مطلع
انوار بنادیا تھا اور جس کے دم سے اس چھوٹے سے قصبہ کو یہ مرکزیت و مقبولیت حاصل تھی
حضرت کی وفات پر علماء و صلحاء جو بڑی تعداد میں جمع تھے متفرق ہوگئے۔ لیکن مولانا
محمد یحیی صاحب رح جنہوں نے حضرت کو اپنے والدین پر اور گنگوہ کو اپنے وطن پر ترجیح دی تھی
وہیں پڑے رہنے کا فیصلہ کیا اور بدستور وہیں مقیم رہے۔

تعلیم کا آغاز

اس زمانہ کے اکثر قدیم گھرانوں، اور شرفاء کے خاندانوں میں رواج تھا کہ چار
سال کی عمر میں بچہ مکتب بٹھادیا جاتا، اور اس کی تسمیہ خوانی ہوجاتی۔ شیخ کے والد مولانا
محمد یحیی صاحب کا معاملہ تو اور بھی خصوصی تھا کہ خود شیخ کی روایات کے مطابق جب دو
چھٹا تو آدھا پارہ حفظ تھا۔ اور سات برس کی عمر میں قرآن مجید کا حفظ مکمل ہوچکا تھا۔
لیکن شیخ کی سات برس کی عمر تک بسم اللہ بھی نہیں ہوئی، بچہ کا نشوونما اور اٹھان اچھا
تھا۔ اس عمر تک تعلیم شروع نہ ہونے پر خاندان کے بزرگوں کو تعجب تھا۔ دادی صاحبہ
نے (جو خود حافظ قرآن تھیں) ایک مرتبہ اپنے لائق فرزند سے فرمایا کہ "یحیی" اولاد کی
محبت میں اندھے نہیں ہوتے، تو نے تو سات سال کی عمر میں حفظ کرلیا تھا، یہ اتنا
بیل پھر رہا ہے، آخر اس سے جوتے گھٹوائے گا، یا کیا کرائے گا؟" مولانا نے اس کے
جواب میں فرمایا کہ "جب تک کھیلے اس کو کھیل لینے دیجئے۔ جس دن یہ کولھو میں
سر دے گا، قبر میں ہی دم لے گا۔"

بالآخر وہ مبارک دن آیا کہ بچہ کی بسم اللہ ہوئی۔ گنگوہ قیام تھا۔ اس زمانہ میں
مظفر نگر کے ایک نیک صالح بزرگ ڈاکٹر عبدالرحمان صاحب مقیم تھے جن کے ساتھ
مولانا محمد یحیی صاحب کی بڑی نشست و برخاست رہتی تھی، ڈاکٹر صاحب کے گنگوہ کے
قیام کا ایک ہی مقصد معلوم ہوتا تھا۔ اور وہ حضرت گنگوہی کی خدمت تھی۔ مولانا

محمد یحییٰ صاحب نے بچہ کو انھیں کے یہاں پڑھنے کے لئے بٹھایا اور شیخ نے قاعدہ بغدادی انھیں سے ختم کیا۔

قرآن مجید کا حفظ اس خاندان کا خصوصی شعار اور تعلیم کا پہلا ضروری مرحلہ تھا، اسی کے مطابق حفظ کا سلسلہ شروع کرایا گیا، مولانا محمد یحییٰ صاحب کا تعلیم و تربیت میں نرالا ہی دستور تھا وہ ایک صفحہ کا سبق دے دیتے اور فرماتے کہ اس کو سو مرتبہ پڑھ کر پھر دن بھر چھٹی ہے، فطرت انسانی اور تقاضائے عمر سے بڑے سے بڑا ہونہار بچہ (خصوصاً جس میں ذہانت کا جوہر بھی ہو) مستثنیٰ نہیں ہوتا۔ شیخ فرماتے ہیں کہ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایک صفحہ سو مرتبہ پڑھنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔ میں بہت جلدی آکر کہہ دیتا کہ سو مرتبہ پڑھ لیا۔ والد صاحب اس پر کچھ زیادہ جرح قدح نہ فرماتے اگلے دن کہتا کہ کل تو کچھ یونہی سا پڑھا تھا، آج ٹھیک ٹھیک سو مرتبہ پڑھا ہے۔ فرماتے کہ آج کے سچ کی حقیقت تو کل معلوم ہوگی۔ سہارن پور آجانے اور عربی شروع ہو جانے کے بعد بھی یہ حکم تھا کہ ایک پارہ کو اتنی مرتبہ پڑھو، مغرب کے بعد ایک صاحب اس کو سنتے تھے۔ اس میں خوب غلطیاں نکلتی تھیں۔ اس پر سہارن پور کے مشہور وکیل مولوی عبد اللہ جان صاحب نے جن کو اس خاندان سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ سے ایک روز کہا، کہ زکریا کو قرآن یاد نہیں۔ مولانا نے فرمایا "بالکل نہیں! انھوں نے کہا کہ کیا بات ہے؟ فرمایا کہ اسے عمر بھر کرنا ہی کیا ہے قرآن ہی پڑھنا ہے یاد ہو جائے گا۔

۱۳۲۸ھ تک یعنی ۱۲، ۱۳ سال کی عمر تک گنگوہ قیام رہا۔ اس عرصہ میں اردو کے دینی رسائل، بہشتی زیور وغیرہ اور فارسی کی ابتدائی کتابیں گنگوہ میں رہ کر پڑھیں، جو زیادہ تر شفیق اور بزرگ۔ چچا مولانا محمد الیاس صاحب نے پڑھائیں۔

سہارنپور کا قیام اور عربی تعلیم کا آغاز

عربی تعلیم کا سلسلہ سہارن پور آکر شروع ہوا، مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ زندگی کے اکثر شعبوں اور بالخصوص تعلیم کے مسئلہ میں مجتہدانہ دماغ رکھتے تھے۔ وہ مروجہ نصاب اور عام طریقہ تعلیم اور درسی کتابوں کی متعارف ترتیب کے خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی تجویز و تجربہ، ذہانت اور خداداد ملکۂ تعلیم کی مدد سے خود ایک نصاب تجویز کر رکھا تھا۔ مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا بھی عمل اسی پر تھا کہ شیخ کی تعلیم کے سلسلے میں بھی اسی اجتہاد و انتخاب سے کام لیا گیا۔ ان کا دستور تھا کہ وہ بغیر کتاب کے زبانی قواعد لکھواتے تھے۔ اس کے بعد دو چار حرف بتا کر مثال و اجوف، ناقص، مضاعف چاروں قاعدوں پر بہت صیغے ان سے بنواتے اور ان کو رٹاتے، شیخ کا بیان ہے کہ صرف میر پنج گنج دس بارہ دن میں سنادی تھی۔ البتہ فصول اکبری میں بہت وقت لگا تھا۔ اسی طرح صرف نحو کی درسی متداول کتابیں خاص طرز اور ترمیم و اضافہ کے ساتھ پڑھیں۔ کافیہ کے ساتھ مجموعہ اربعین اور نفحۃ الیمن کی جگہ (جس سے مولانا بہت ناراض تھے[۱]) پارہ عم کا ترجمہ پڑھایا۔ نفحۃ الیمن کے صرف باب ثالث کے قصائد پڑھے، اس کے بعد قصیدہ بردہ، بانت سعاد، قصیدہ ہمزیہ، مقامات سے پہلے پہلے پڑھ لیے۔

حضرت گنگوہی کی وفات کے بعد مولانا محمد یحییٰ صاحب تقریباً ہر سال کتب حدیث کے باقی ماندہ حصہ کی تکمیل کرانے کے لیے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی دعوت پر مظاہر العلوم سہارن پور تشریف لے جایا کرتے تھے۔ لیکن ۱۳۲۸ھ میں مولانا کے اصرار اور تقاضہ پر گنگوہ کا قیام ترک کر کے سہارن پور کا مستقل قیام اختیار فرمالیا۔ اور مدرسہ کے اساتذہ اور

---

[۱] فرماتے تھے کہ ایک فاسد العقیدہ آدمی نے ایک انگریز کی فرمائش پر یہ کتاب لکھی، معلوم نہیں ہمارے بزرگوں نے اس کو اس قدر اعزاز کیوں بخشا۔

مدرسین میں شامل ہوگئے یہ تعلق اعزازی تھا۔ اس طرح شیخ کی تعلیم کا سلسلہ سہارنپور
میں شروع ہوگیا۔ آپ نے بقیہ درسیات کی تکمیل کی۔ کتب منطق، مولانا حافظ عبداللطیف
صاحب ناظم مظاہر العلوم، جن کو معقولات سے خصوصی مناسبت تھی، سے پڑھیں۔ بقیہ
معقولات کی تعلیم مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی استاد مظاہر العلوم سے پائی، جو معقولات
کے بڑے جید الاستعداد استاد تھے۔

درسیات کی تکمیل

شیخ نے نصاب کی منتہیانہ کتابیں خود مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ سے ختم کیں۔ مولانا کی تدریس
خاص اصول اور طریقہ تھا۔ ان کے یہاں استاد کے خود تقریر کرنے اور سارے مطالب کو خود
حل کرکے دے دینے کا دستور نہ تھا، جیسا کہ اس وقت بڑے بڑے عربی مدرسوں میں رائج
ہوگیا ہے کہ استاد شرح و بسط کے ساتھ تقریر کرتے ہیں اور مطالب کے حل کرنے کی ساری
ذمہ داری انہیں پر ہوتی ہے۔ طلبہ کی حیثیت صرف سامع اور شریک مجلس کی ہوتی ہے۔
مولانا کے یہاں طالب علم کا مطالعہ کرکے سبق کو پورے طور پر حل کرکے لانے کی پابندی
تھی۔ وہ صرف وہیں رہنمائی اور مدد فرماتے تھے، جہاں طالب علم کی قوت مطالعہ اور فہم
کی رسائی نہ ہو اور شرح و حواشی سے مدد ملتی ہو[1]۔ اسی لئے ان کے یہاں اہمیت کتاب کے
حرفاً حرفاً ختم کرنے کے بجائے کتاب کے مطالب اور موضوع پر حاوی ہو جانے اور مطالعہ
میں ملکہ پیدا ہو جانے میں تھی۔ اور جس وقت ان کو اطمینان ہو جاتا تھا وہ کتاب کو بائے بسم اللہ
سے تمت تک ختم کرانے کو ضروری نہیں سمجھتے تھے اور دوسری کتاب شروع کرادیتے
تھے۔

---

[1] قدیم اساتذہ کا یہی دستور تھا، اور اس وقت تک کے تجربوں اور تعلیمی نظریات کے مطابق یہی
بہترین اصول تعلیم ہے۔

اس زمانہ میں مولانا ماجد علی صاحبؒ کی معقولات کے درس و تعلیم میں خاص شہرت
۔۔۔ انھوں نے معقولات کی اعلیٰ کتابیں خیرآبادی اساتذہ سے بڑی تحقیق اور محنت سے
۔۔۔ تھیں۔ اور ان کو معقولات کی تعلیم میں بڑا توغل اور انہماک تھا۔ دور دور سے لوگ
۔۔۔ سے منطق و فلسفہ کی اعلیٰ کتابیں پڑھنے مینڈھو ضلع علی گڑھ وغیرہ جایا کرتے تھے
۔۔۔ نا ماجد علی صاحب نے حدیث حضرت گنگوہی سے پڑھی تھی[1] اس درس میں مولانا
۔۔۔ یٰ صاحب ان کے رفیق تھے۔ دونوں میں بڑی دوستی اور بے تکلفی تھی۔ اس تعلق
۔۔۔ پر اور کچھ شیخ کی غیر معمولی ذہانت اور علمی مناسبت دیکھ کر انھوں نے مولانا یحییٰ سے
۔۔۔ کہ شیخ کو ایک سال کے لئے ان کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ ان کی معقولات کی تکمیل کرادیں
۔۔۔ اور یہ بھی فرماتے تھے کہ مجھے امید ہے کہ وہ بخاری شریف بھی مجھی سے پڑھنے کی خواہش
۔۔۔ ے گا۔ لیکن اس کی نوبت نہ آئی۔ اور شیخ کو اپنی تعلیمی تکمیل اور حصول علم کے لیے سہارنپور
۔۔۔ کہیں باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔
مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کو تعلیم سے کہیں زیادہ تربیت کا اہتمام تھا۔ ان کے

---

[1] ۔۔۔ ولانا ماجد علی صاحب مانیکلاں ضلع جونپور کے رہنے والے تھے۔ معقولات کی تعلیم مولانا عبد الحق صاحب خیرآبادی سے
۔۔۔ ۔ حدیث گنگوہ جاکر پڑھی۔ مینڈھو، گلاؤٹی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں عرصہ تک مدرس رہے۔ علوم عقلیہ اور
۔۔۔ منطق کے درس و تدریس میں نامور اور مرجع طلبا تھے۔ ۲۳ رمضان ۱۳۶۳ھ میں عین عید الفطر کے دن وفات پائی۔ اور
۔۔۔ وطن میں مدفون ہوئے۔ [2] مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ کی تربیت کے نرالے انداز اور انکی ذہانت اور
۔۔۔ ت فہم کے عجیب واقعات ہیں۔ یہاں پر ایک واقعہ درج کیا جاتا ہے۔ جب شیخ کی فقہ کی تعلیم شروع
۔۔۔ ی تو اس افتتاح کے موقع پر مولانا نے شیخ کو بیس روپے عطا فرمائے، پھر ارشاد فرمایا کہ ان کا کیا کروگے؟
۔۔۔ نے جواب دیا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ اکابر ثلٰثہ سہارنپوری، دیوبندی، رائے پوری، تھانوی کی
۔۔۔ مت میں پانچ پانچ روپے کی مٹھائی پیش کردوں۔ بڑی مسرت کے ساتھ اس کی تصویب فرمائی — پھر

یہاں پڑھنے اور محنت کرنے سے زیادہ اس بات کی نگرانی ہوتی تھی کہ شیخ کسی لڑکے یا اپنے کسی رفیق یا کسی نوجوان کے ساتھ بے تکلف نہ ہوں اور کسی سے ان کا خلاملانہ ہونے پائے۔ اس پر ان کی نگاہ بڑی کڑی رہتی تھی۔ کہ شیخ کسی سے ہنستے بولتے یا کسی ساتھی یا اہل محلہ سے راہ و رسم تو نہیں پیدا کرتے ہیں۔ راستہ چلتے اگر وہ کسی کو خصوصیت کے ساتھ سلام کرتے یا ایک نماز سے زیادہ نمازوں میں کسی ہم عمر یا نوجوان کے برابر کھڑے ہوتے تو اس پر جواب طلب ہو جاتا۔ اور تنبیہ کی نوبت آتی۔ اس ڈر سے شیخ بھی اس کی بڑی احتیاط رکھتے۔ اور سب سے الگ تھلگ اپنے کام میں مشغول رہتے مولانا محمد یحییٰ صاحب کی احتیاط اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ اپنے یا مولانا محمد الیاس صاحب رحمہ کی ہمراہی کے بغیر مدرسہ سے باہر جانے یا مجلس میں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی سیر و تفریح کا شوق پیدا نہ ہوا اور وہ طبیعت ثانیہ بن گئی، سہارنپور میں بڑے بڑے جشن کا موقع آتا اور نمائش ہوتی آپ والد صاحب کی اجازت کے باوجود اس میں شریک نہ ہوتے۔ یہ یکسوئی اور تنہائی پسندی اتنی بڑھی کہ ایک مرتبہ مدرسہ قدیم سے چھ مہینے تک باہر جانے کی نوبت نہ آئی [1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۷) دریافت فرمایا کہ کونسی مٹھائی۔ شیخ نے متفرق مٹھائیوں کے نام لئے فرمایا لاحول ولا قوۃ۔ ان میں سے کون ایسا ہے جو مٹھائی کھائے گا، تمہاری خاطر میں ایک آدھ ڈلی چکھ لیں گے۔ باقی سب دوسروں کی نذر ہو جائے گی۔ ایسا کرو کہ پانچ روپے کی مصری (شکر) خرید کر حضرت کی خدمت میں پیش کر دو۔ ایک مہینہ تک تمہاری ہی مصری کی چائے نوش فرمائیں گے۔ چنانچہ تعمیل کی گئی۔ بقیہ اکابر ثلاثہ کی خدمت میں پانچ پانچ روپے نقد مختلف اوقات میں پیش کر دیئے گئے ان سب حضرات نے بڑی مسرت سے قبول فرما کر دعائیں دیں۔

[1] مدرسہ قدیم میں ابتدا سے سب ضروریات کا انتظام ہے۔ مدرسہ کتب خانہ مسجد غسل خانہ اور بیت الخلاء سب موجود ہیں۔ بیت الخلاء کے لئے کچھ ٹوٹے پھوٹے جوتے بھی پڑے رہتے ہیں۔ اس طرح بعض اوقات شیخ کو مہینوں، مہینوں اپنا جوتہ استعمال کرنے یا نیا جوتہ خریدنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔

حدیث کا آغاز

بالآخر وہ مبارک دن اور وہ مبارک ساعت آئی کہ اس علم کی تعلیم کا آغاز ہوا جس کے دامن سے ساری عمر وابستہ رہنے اور اسی کی خدمت کے لئے وقف ہو جانے کا فیصلہ قضا و قدر میں ہو چکا تھا اور جس کی نسبت پیدائشی نام پر اس طرح غالب ہو کر رہنے والی تھی کہ "شیخ الحدیث" نام کا قائم مقام اور نام سے بھی زیادہ مشہور ہوا۔ اس دن حدیث کے خادموں اور اس کے ناشرین و شارحین کی صف میں ایک وقیع اضافہ ہونے والا تھا۔ اور کیا عجیب ہے کہ اس "نو وارد" کی آمد پر اس فن اور اس کے مخلص خدمت گزاروں کی روح نے کہا ہو ؎

آمد آں یارے کہ ما می خواستیم

اس سلسلے کا آغاز بھی بڑے اہتمام کے ساتھ ہوا، پہلے مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے غسل فرمایا، پھر مشکوٰۃ شریف کی بسم اللہ کرائی، خطبہ پڑھا، پھر رو بہ قبلہ ہو کر دیر تک دعا کی۔ شیخ فرماتے ہیں کہ یہ تو نہیں معلوم ہو سکا کہ والد صاحب نے کیا کیا دعائیں کیں لیکن میری ایک ہی دعا تھی اور وہ یہ کہ "حدیث کا سلسلہ دیر میں شروع ہوا، خدا کرے کبھی چھوٹے نہیں"[1]

مولانا محمد یحییٰ صاحب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایسے شاگرد تھے کہ استاد کو بھی اپنے اس شاگرد پر ناز تھا۔ حضرت کے عمیق مطالعہ، دقیق فہم اور خصوصی تحقیقات علمیہ کے ماسوا کہ مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے ان کو قلم بند بھی کیا اور ان کی شرح و وضاحت بھی فرمائی[2]۔ وہ اپنی خداداد علمی مناسبت و ذکاوت، فن حدیث سے شغف و انہماک،

---

[1] اس دعا کی قبولیت کے آثار سب کے سامنے عیاں راچہ بیاں۔ [2] ملاحظہ ہو تو ترمذی کی تقریر درس و تعلیقات موسوم بہ "الکوکب الدری" اور بخاری کی تعلیقات معروف بہ "لامع الدراری"

اور اپنی نکتہ رس طبیعت اور ذوق سلیم کی وجہ سے حدیث کی تدریس اور فقہ و حدیث کی تطبیق میں اخاص مقام رکھتے تھے، اور ان کے شاگرد رشید ان کے درس کے بعد کم کسی کے درس حدیث کے قائل ہوتے تھے۔

دورۂ حدیث

۱۳۳۳ھ میں دورۂ حدیث کی ابتدا ہوئی، یہی سال تھا جب حضرت سہارنپوری اور حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہما نے طویل قیام کے ارادے سے حجاز کا قصد کیا۔ شیخ کا خیال تھا کہ مجھے نہ ملازمت کرنی ہے اور نہ کوئی عجلت ہے۔ ایک سال میں دورہ حدیث مکمل کرنے کی کوئی پابندی نہیں۔ اس لئے اپنے والد محمد یحیٰی صاحب کے درس میں ابوداؤد شروع کر دی۔ ترمذی شریف کو حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ کی واپسی پر ملتوی رکھا تھا۔ لیکن بعض اسباب کی بنا پر ترمذی، بخاری اور (ابن ماجہ کے سوا) بقیہ کتب صحاح والد صاحب ہی سے پڑھیں، یہ سال بڑی محنت اور انہماک کا تھا۔ اس کا بڑا اہتمام تھا کہ کوئی روایت بھی بے وضو نہ پڑھی جائے۔ مسلسل پانچ۔ چھ گھنٹے سبق ہوتا تھا۔ اس میں کبھی کبھی ہفتہ عشرہ میں سبق کے درمیان وضو کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اور اتنی دیر کے لئے اٹھنا ہوتا تو سمجھدو ہم مذاق رفیق کوشش کرتے کہ حرج نہ ہو اور سبق آگے نہ بڑھنے پائے۔

حضرت سہارنپوری سے بیعت

شوال ۳۳ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب طویل قیام کے ارادے سے حجاز کا قصد فرما رہے تھے اور لوگ کثرت سے بیعت ہو رہے تھے، شیخ فرماتے ہیں کہ کولہو کی طرح سے دیکھا دیکھی اپنے اندر بھی جذبہ پیدا ہوا، حضرت سے عرض کیا۔ حضرت نے فرمایا کہ جب میں مغرب کے بعد نفلوں سے فارغ ہو جاؤں، اس وقت آجانا۔ مولانا عبداللہ صاحب گنگوہی جو خلافت سے سرفراز ہو چکے تھے انھوں نے بھی تجدید کی درخواست

کر رکھی تھی۔ حضرت نے فراغت کے بعد دونوں کو قریب بلایا اور اپنے دونوں ہاتھ دونوں کے ہاتھوں میں پکڑا دیئے اور بیعت کے الفاظ کہلوانا شروع کئے۔ مولانا عبداللہ صاحب نے ہچکیوں کے ساتھ دھاڑیں مار کر رونا شروع کیا جس کا اثر حضرت پر بھی تھا حضرت کی آواز بھرا گئی۔ اس وقت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ اوپر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ یہ آواز سن کر منڈیر پر دیکھنے کے لئے آئے۔ دیکھا تو شیخ بھی بیعت ہو رہے ہیں۔ اس پر مولانا کو تعجب اور احساس ہوا کہ بلا علم و اطلاع کے انھوں نے اتنا بڑا کام کر لیا۔ لیکن حضرت رائے پوریؒ نے اس جرأت کی بڑی تصویب فرمائی اور بہت دعائیں دیں۔

مولانا محمد یحییٰ صاحب کی وفات اور شیخ کی بلند ہمتی

مولانا محمد یحییٰ صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے ۱۰ ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ میں وفات پائی جس دن حضرت سہارن پوری بمبئی پہونچے اور جہاز سے اترے۔ اسی دن یہ واقعہ پیش آیا۔ حضرت کو حادثہ کی اطلاع تار سے ملی، لیکن ریشمی خطوط اور حضرت شیخ الہند کے معاملہ کی تحقیق کے سلسلے میں آپ کو نینی تال لے جایا گیا اور وہاں چند روز قیام کرنا پڑا۔

شیخ نے اس صدمہ کو اپنی نو عمری کے باوجود اپنے اس ضبط و تحمل اور قوت ایمانی سے نہ صرف برداشت کیا، جو اہل یقین اور اصحاب نسبت کی شان ہے، بلکہ پورے خاندان اور غم زدہ گھر کے لئے تسکین و تقویت کا ذریعہ بن گئے۔ مولانا نے آٹھ ہزار کا قرض چھوڑا تھا۔ شیخ نے اس موقعہ پر بڑی مردانگی اور بلند ہمتی کا ثبوت دیا، جن کا بھی علم ہو سکا ان کو فوراً یہ خطوط لکھ دیئے کہ مرحوم قرضہ سے بری ہیں، وہ قرضہ میرے ذمہ ہے۔ اس وقت شیخ کی عمر انیس ۱۹ سال کی تھی، عام طور پر سب قرض خواہوں کو قدرتاً یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ رقم ضائع ہو جائے گی، اس لئے بہت شدت سے مطالبے شروع ہو گئے۔ شیخ ایک سے لے کر دوسرے کو ادا کر دیتے تھے۔

یہ سال سخت شدت کا گزرا، مولانا مرحوم کا قرض تو دو تین مہینے میں ختم ہو گیا اور وہ اس سے بالکل سبکدوش ہو گئے۔ البتہ شیخ مقروض ہو گئے۔ ۴۴ھ تک اس قرضہ کا جو مولانا کے قرض کی ادائیگی میں ہو گیا تھا۔ ایک ہزار شیخ کے ذمہ باقی تھا جس کی ادائیگی ۱۳۴۴ھ میں حج کے سفر کے موقعہ پر مولوی نصیر الدین صاحب کے حوالے کر کے گئے جو اس وقت ناظم کتب خانہ تھے۔

طالب سے زیادہ مطلوب

ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ میں مولانا محمد یحییٰ صاحب نے انتقال فرمایا۔ تو صدمہ کی شدت اور محبت کے جذبہ سے لائق فرزند کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ بس اب دوبارہ بخاری، ترمذی پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے واپسی پر حکم فرمایا کہ ترمذی و بخاری دوبارہ پڑھنا ہے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ طبیعت بالکل نہیں چاہتی تھی۔ لیکن انکار کی کوئی صورت نہ تھی، اسی دوران میں خواب دیکھا کہ حضرت شیخ الہند (مولانا محمود حسن دیوبندیؒ) فرماتے ہیں کہ مجھ سے بخاری پڑھ لو، سوچتا رہا کہ حضرت مالٹا میں اسیر ہیں۔ ان سے پڑھنے کہاں جاؤں؟ حضرت نور اللہ مرقدہ نے خواب سنا تو فرمایا کہ اس کی تعبیر یہی ہے کہ مجھ سے دوبارہ پڑھو۔

بالآخر حضرت کے یہاں کتابیں شروع ہوئیں، یہ سال انتہائی انہماک کا دور تھا، فرماتے ہیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے شب و روز میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ سونا نہیں ہوتا تھا۔ ساری رات شروح حدیث کا مطالعہ کرتے اور سبق میں پورے طور پر تیار ہو کر جاتے، اس محنت و انہماک اور فطری سعادت اور خوش بختی نے حضرت کی نظر انتخاب کو متوجہ کر لیا۔ اور وہ تقریب پیدا ہوئی جو شیخ کامل کے قرب و اختصاص اور استاذ فاضل کے انتخاب و اعتماد کی موجب ہوئی۔ اور اس سے شیخ کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جو ان کے مستقبل کی کامیابیوں اور اقران و اماثل میں خصوصیت

امتیاز کا راز ہے۔

بذل المجہود کی تالیف میں اعانت و شرکت

درس میں شرکت کو دو مہینے گزرے تھے۔ حضرت ایک دن سبق پڑھا کر دار الطلبہ سے مدرسہ قدیم آرہے تھے، شیخ حسب معمول ساتھ تھے، راستہ میں ایک جگہ کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا: "ابوداؤد پر ہمیشہ کچھ لکھنے کی خواہش رہی، تین مرتبہ شروع کر چکا ہوں، لیکن مشاغل کے ہجوم نے چلنے نہ دیا۔ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی حیات میں بار بار شروع کیا۔ یہ جی چاہتا رہا کہ کسی طرح لکھ لوں اور جو اشکال ہو، حضرت قدس سرہ سے حل کر لوں، حضرت کے وصال کے بعد یہ جذبہ سرد ہو گیا۔ لیکن پھر یہ خیال ہوا کہ ہمارے مولانا یحییٰ صاحب تو حیات ہیں ان سے بحث و مباحثہ کرتے رہیں گے۔ مگر ان کی وفات پر یہ ارادہ بالکل نکال دیا تھا۔ اب مجھے یہ خیال ہو رہا ہے کہ اگر تم دونوں[1] میری مدد کرو تو میں شاید لکھ لوں۔"

شیخ نے بیساختہ جواب دیا کہ "حضرت ضرور شروع کریں اور یہ میری دعا کا اثر ہے۔" حضرت نے فرمایا، کیسی دعا؟ شیخ نے کہا کہ میں نے مشکوٰۃ شروع کرتے وقت یہ دعا کی تھی کہ یا اللہ حدیث پاک کا سلسلہ بہت دیر میں شروع ہوا ہے، یہ اب مجھ سے چھوٹے نہیں، مگر اس کو میں محالات سے سمجھتا تھا اور یہ سوچتا تھا کہ اگر میں پڑھنے کے بعد مدرس بھی ہو گیا تو حدیث تک نہ معلوم کتنے سال میں پہونچوں گا؟ اس لئے کہ قدیم مدرسین جو کئی سال سے پڑھا رہے ہیں ان کو حدیث ابھی تک پڑھانے کی نوبت نہ آئی۔ اب صورت سمجھ میں آ گئی، حضرت کی شرح میں اس ناکارہ کا اشتغال

---

[1] یعنی شیخ الحدیث اور ان کے رفیق قدیم مولوی حسن احمد مرحوم، جو محلہ کھالے پار سہارنپور کے رہنے والے تھے اور نہایت خاموش، متین و سنجیدہ، مسکین طبع نوجوان تھے۔ جوانی ہی میں انتقال ہو گیا۔ رحمہ اللہ

رہے گا۔ اور جب تک وہ مکمل ہو، کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ حدیث کی تدریس تک پہنچا دے۔ یہ واقعہ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ کا ہے۔ یہی شرح بذل المجہود کی ابتدا ہے۔

حضرت نے اسی وقت شروح حدیث کی ایک لمبی چوڑی فہرست بتا دی، اور کتب خانہ سے لینے کا حکم فرما دیا۔

تدریس پر تقرر

یکم محرم ۱۳۳۵ھ کو بہ حیثیت مدرس مظاہر العلوم میں تقرر ہوا۔ پندرہ روپیہ[1] تنخواہ مقرر ہوئی۔ ابتداءً دو سبق، اصول الشاشی، جو پہلے مولانا محمد الیاس صاحب کے یہاں ہو رہی تھی اور علم الصیغہ جو مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی کے پاس تھی منتقل ہو کر آئے، اس کے علاوہ چار پانچ سبق، نحو و منطق اور فقہ کی ابتدائی کتابوں کے تھے۔ اس وقت شیخ کی عمر بیس سال تھی اور مدارس کی روایات اور دستور کے لحاظ سے ان کو اصول الشاشی گویا قبل از وقت مل گئی تھی۔ لیکن ...... شیخ نے اپنی محنت و ذہانت اور مطالعہ و

---

[1] اس زمانہ کے قدیم مدارس میں تنخواہوں کا معیار آج سے بہت مختلف تھا خصوصاً ابتدائی مدرسین کی تنخواہیں اتنی کم ہوتی تھیں جو آج کل کے لوگوں کے قیاس میں مشکل سے آئیں گی چنانچہ مولانا منظور احمد صاحب کی جو اس وقت مدرسہ کے بڑے اساتذہ میں سے ہیں ابتدائی تنخواہ چار روپے تھی، بہت عرصہ کے بعد دہ بارہ تک پہونچے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ میری پندرہ روپے کی تنخواہ پر سب کی انگلیاں اٹھی تھیں۔ حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ نے جو مدرسہ کے سرپرستوں میں سے تھے۔ بہ حیثیت سرپرست کے فرمایا کہ شیخ پر والد صاحب کے انتقال کے بعد جو بار ہے اس کے لحاظ سے یہ تنخواہ کم ہے کم سے کم روپیہ پچیس ہونی چاہیے تھی۔ لیکن شیخ نے فرمایا کہ جب اللہ توفیق دے تو یہ تنخواہ چھوڑ دینا چنانچہ شیخ نے اس پر عمل کیا اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

تیاری سے اپنی غیر معمولی اہلیت اور استحقاق کا ثبوت دیا، اور طلبہ اتنے مطمئن اور گرویدہ ہوئے کہ انھوں نے پڑھا ہوا حصہ بھی شیخ سے دوبارہ پڑھنے کی خواہش کی

اگلے تعلیمی سال شوال ۱۳۳۵ھ میں پہلے سال سے اونچی اور درسی و فنی لحاظ سے اہم کتابیں پڑھانے کو ملیں، تیسرے سال شوال ۱۳۳۶ھ میں مقامات حریری، اور سبعہ معلقہ بھی درس میں آئے۔ سبعہ معلقہ منتظمین نے بڑے شک و تذبذب کے ساتھ دیا تھا۔ اس جماعت میں وہ طلبہ جو حدیث کے بعض اسباق میں شیخ کے ہم درس رہے تھے، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد مدرسہ کے قابل احترام اور مخلص ناظم مولانا عنایت الٰہی صاحب نے ان لفظوں میں شیخ کی کامیابی کا اعتراف کیا کہ "مولوی زکریا تم نے تو میری آنکھیں نیچی کردیں"۔ ۱۳۳۷ھ میں ہدایہ اولین، حماسہ وغیرہ اور رجب ۱۳۴۱ھ میں بخاری شریف کے تین پارے بھی حضرت سہارنپوری کے حکم و اصرار سے منتقل ہوکر آئے اور ان کے پڑھانے میں بھی شیخ سے غیر معمولی اہلیت، قوت مطالعہ اور فنی مناسبت کا اظہار ہوا۔ اور اس کے بعد آپ کو مشکوٰۃ مل گئی۔ ۱۳۴۴ھ تک مشکوٰۃ آپ کے زیر درس رہی۔

بذل المجہود کے کام کا انہماک، اور حضرت سہارنپوری کی خصوصی شفقت و اعتماد

شیوخ کاملین سے استفادہ اور باطنی ترقیات میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ ان کی مفوضہ خدمت کی تکمیل اور ان کے ذوقی مشغلہ میں جو ان کو دل و جان سے عزیز ہوتا ہے، تندہی، خود فراموشی اور جانکاہی سے رفاقت و اعانت کی جائے، اہل بصیرت کے نزدیک ایک مسترشد کو اس سے اپنے شیخ کی جو محبوبیت و اعتماد حاصل ہوتا ہے اور اس سے جو باطنی ترقیات حاصل ہوتی ہیں، اور جس سرعت کے ساتھ سلوک کے مدارج طے ہوتے ہیں وہ عام طور پر کسی اور راہ سے، اور بعض اوقات بڑے بڑے مجاہدات سے بھی طے نہیں ہوتے۔ اس زمانہ میں حضرت سہارن پوری ہمہ تن "بذل المجہود" کی تالیف

کی طرف متوجہ تھے۔ اور اس کی تکمیل کا جذبہ اور ذوق ہر چیز پر غالب تھا۔ یہ شیخ کی بڑی خوش قسمتی اور اس کے ساتھ ہی ان کی بڑی ذہانت اور حقیقت شناسی تھی کہ انھوں نے اپنے کو اس کام کے لئے وقف کر دیا اور دنیا وما فیہا سے بے خبر اور بے تعلق ہو کر اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ اس میں لگ گئے تالیف کا طرز یہ تھا کہ حضرت شروح حدیث اور ماخذ کی نشاندہی فرما دیتے۔ شیخ ان کا مطالعہ کر کے متعلقہ مواد جمع کر لیتے اور حضرت کی خدمت میں اس کو پیش فرما دیتے۔ حضرت اپنے الفاظ میں اس کو منتخب اور مرتب کر کے مصنفانہ حیثیت سے لکھواتے، تسوید اور تحریر کا یہ کام شیخ انجام دیتے، اس نتیجہ میں حضرت کا قرب و اختصاص روز بروز بڑھتا چلا گیا۔

انسانی فطرت کے مطابق اس چیز نے شیخ کے ہم عمروں اور ان نوجوان علماء یا ان کے سرپرستوں کے دل میں رشک اور منافست کا جذبہ پیدا کیا۔ جو حضرت کا قرب اختصاص چاہتے تھے۔ ان میں سے بعض حضرات نے کہا کہ اس مشغولیت سے تدریس پر اثر پڑتا ہے۔ اس کے لئے کسی ایسے معین کا انتخاب ہونا چاہیے جس پر تدریس کا بار نہ ہو، اور وہ مدرسہ کا ملازم نہ ہو، چنانچہ ایک دوسرے صاحب اس کام کے لئے مقرر ہوئے لیکن جن کو مقرر کیا گیا وہ جلدی جلدی گھبرا جاتے تھے حضرت کو اس سے گرانی ہوتی اس پر شیخ نے پھر اپنی خدمات کی پیش کش کی، حضرت نے ارشاد فرمایا کہ "یہ میرا کام دوسرے سے نہیں چلتا"۔ اس طرح وہ خدمت بھی پھر شیخ کے سپرد ہو گئی۔ دوسری مرتبہ تسوید و تحریر کے لیے ایک ایسے صاحب کو مقرر کیا گیا جو زیادہ خوش خط تھے، لیکن کاپی نویس نے کہہ دیا کہ مجھے شیخ کے خط سے نقل کرنے میں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں لفظوں وغیرہ کا اہتمام رہتا ہے، اس طرح گھوم پھر کر یہ خدمت شیخ ہی کے پاس آ گئی۔

شیخ نے اس عرصہ میں سوائے شدید مجبوری کے ہر طرح کے سفر، نقل و حرکت

اور ہر اس چیز سے جس سے اس کام میں حرج واقع ہو گریز کیا۔ ان کو پہلے بھی سفر سے وحشت اور عدم مناسبت تھی۔ اس زمانہ تالیف میں انھوں نے اپنے کو گویا بالکل پابہ زنجیر بنالیا۔ بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ بعض بزرگوں اور عزیزوں کے اصرار سے حضرت نے کسی سفر میں اپنے ساتھ لے لیا۔ شیخ نے موقعہ دیکھ کر راستہ میں عرض کیا کہ اگر اس سفر میں ہم رکابی رہی تو "بذل" کی کاپیوں کی تصحیح میں حرج واقع ہوگا۔ اس لئے راستہ ہی سے واپسی کی اجازت دی جائے۔ حضرت نے یہ سن کر بخوشی اجازت دیدی۔ اور شیخ راستہ ہی کے کسی اسٹیشن سے واپس آگئے۔

جب "بذل" کی طباعت کا مرحلہ شروع ہوا تو پہلے اس کا انتظام میرٹھ میں کیا گیا، اس کے بعد تھانہ بھون میں مولانا شبیر علی صاحب کے پریس میں اس کو منتقل کردیا گیا۔ اس وقت شیخ کا معمول یہ تھا کہ جمعرات کی شام کو تھانہ بھون جاتے اور سنیچر کی صبح کو واپس آتے۔ یہ سفر ہر ہفتہ یا پندرہ دن میں ایک مرتبہ پیش آتا۔ اس میں بھی کبھی جاتوار کو پریس کو چھٹی نہ ہوتی تو ایک آدھ دن بڑھ جاتا، عرصہ تک یہ معمول رہا۔ اس کے بعد ۴۲ھ سے ۱۳۴۴ھ تک دہلی کے ہندستانی پریس میں طباعت کا کام ہوتا رہا اس زمانہ میں اکثر ہفتہ وار اور کبھی پندرہ دن میں دہلی جانا ہوتا تھا۔ جمعہ کی شب میں بارہ بجے کی گاڑی سے روانہ ہوتے، بارہ بجے تک اپنا کام کرتے، پھر تنہا پیادہ پا اسٹیشن جاتے "بذل" کی کاپیاں سینہ سے لگا کر سو جاتے۔ دہلی اسٹیشن سے سیدھے مطبع جاتے، شام کو مطبع کے بند ہونے کے بعد شیخ رشید احمد صاحب مرحوم کے یہاں تشریف لے آتے اور دوسرے دن اتوار کی شب میں دہلی سے روانہ ہوکر ایک بجے سہارنپور پہنچ جاتے۔ یہ ان کا دو تین سال کا مستقل معمول رہا، شیخ فرماتے ہیں کہ اتوار کو پریس کی چھٹی ہوتی تھی۔ لیکن ہندستانی پریس کے مالک جو ایک شریف اور خلیق ہندو تھے، اس ناکارہ کے ساتھ ضرورت سے زیادہ مدارات کرتے وہ بھی کبھی

میرے کام کی اہمیت کی وجہ سے ایک دو شینبوں کی چھٹی موقوف کردیتے، اور کارکنوں
کو اور ٹائم دیتے، اس صورت میں بجائے اتوار کی شب کے پیر منگل کو واپسی ہوتی
شمائل ترمذی کا ترجمہ "خصائل نبوی" انھیں ایام میں صرف دہلی کے قیام میں لکھا
گیا، جب دہلی جاتا تو حاجی محمد عثمان صاحب مرحوم کی دکان سے جو پریس کے بالکل
قریب تھی یہ اوراق اٹھا لیتا اور پروفوں کی تصحیح سے جو وقت بچتا اس میں ایک آدھ
صفحہ کا ترجمہ لکھ لیتا۔ اور جب واپس آتا تو ان اوراق کو انھیں کی دکان پر رکھ کر چلا
آتا، گویا یہ تالیف صرف ایام سفر کی ہے۔ البتہ نظر ثانی میں طباعت کے وقت کچھ
اضافے ہوئے۔"

عقد نکاح

مولانا محمد یحییٰ صاحب کے انتقال پر مشائخ کی والدہ صاحبہ کو بخار شروع ہو گیا
تھا اور اس سے بڑھتے بڑھتے تپ دق کی صورت اختیار کرلی۔ انھوں نے مولانا کے
انتقال کے بعد ہی سے شدت سے شیخ کی شادی کا تقاضہ کیا اور فرمایا کہ میں جلد ہی جانے
والی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ تیرا گھر کھلا رہے۔ شیخ کی نسبت مولانا رؤف الحسن
صاحب کی صاحبزادی سے تھی[1] انھوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار حضرت سہارنپوری
سے کیا، حضرت نے کاندھلہ لکھوادیا۔ کہ میرا خیال ہے کہ عزیز زکریا کا نکاح جلد ہو جائے
امتثال حکم میں ان حضرات نے لکھ دیا کہ جب چاہیں تشریف لے آئیں، چنانچہ حضرت
چند آدمیوں کو لے کر کاندھلہ تشریف لے گئے۔ نکاح کے بعد شیخ نے کہلوایا کہ کاندھلہ تو
میرا وطن ہے رخصتی کرا کے لیجانے کی ضرورت نہیں۔ میں دو تین روز کاندھلہ ٹھہر کر

---

[1] ایک صاحبزادی مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے نکاح میں تھیں جو مولانا محمد یوسف صاحب کی والدہ تھیں اس طرح شیخ اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ ہم زلف بھی تھے۔

چلا آؤں گا۔ کاندھلہ والوں نے قدرتاً اس کو بہت پسند کیا، لیکن جب حضرت کو یہ فقرہ پہونچا تو فرمایا کہ "وہ کون ہے لے جانے والا؟ باپ بن کر تو میں آیا ہوں لڑکی کل کو میرے ساتھ جائے گی۔" چنانچہ دوسرے دن رخصتی ہوگئی۔ اور یہ حضرت سہارن پور واپس آئے۔ ۲۷ رمضان ۱۳۳۵ھ کو والدہ ماجدہ نے انتقال کیا حضرت سہارن پوری نے نماز جنازہ پڑھائی۔

پہلا حج

۱۳۳۸ھ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری نے پھر حج کا عزم فرمایا۔ شیخ کو اب تو یہ یاد نہیں کہ ان پر حج فرض تھا یا نہیں؟ لیکن بیت اللہ کا شوق اور مرشد کی ہمرکابی کا جذبہ، رفاقت کا محرک ہوا۔ یہ شیخ کا حج اسلام (پہلا حج) تھا شعبان ۱۳۳۸ھ کی کسی تاریخ کو روانگی ہوئی۔ حضرت نے بمبئی میں اعلان فرمادیا کہ جس کو جس سے مناسبت ہو وہ اس کے ساتھ کھانے میں شریک ہو، شیخ مولوی مقبول صاحب کی اجازت و منظوری سے جو حضرت کے منتظم کار تھے حضرت ہی کے شریک طعام اور خادم خاص رہے۔ جس کو حضرت نے بخوشی منظور کرلیا۔ شیخ نے مصارف کے لئے اپنی پوری رقم بلا حساب کتاب مولوی مقبول صاحب کے حوالے کردی۔ جہاز ہی میں رمضان شروع ہوگیا۔ تراویح کا انتظام ہوا۔ حضرت مولانا[1] و شیخ دونوں قرآن شریف سناتے تھے، مکہ معظمہ حاضری ہوئی۔ تو مولانا محب الدین صاحبؒ نے جلد ہندوستان واپس جانے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ یہاں تو ایک قیامت آنے والی ہے[2]

رمضان مبارک میں شیخ کا معمول تھا کہ تراویح سے فراغت کے بعد روزانہ

---

[1] آپ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلیفہ اور بڑے صاحب کشف و ادراک بزرگ تھے۔

[2] شریف حسین کی بغاوت اور نجدیوں کے حملے کی طرف اشارہ ہے۔

احرام کی چادریں لے کر پیدل اپنے چند ہم عمر نوجوان ساتھیوں کے ساتھ "تنعیم" جاتے اور "عمرہ" لاتے، ساری رات اسی مبارک معمول میں گزرتی، اس زمانہ میں حجاز میں سخت بدامنی تھی، قافلے لٹتے تھے اور حجاج سخت خطرات اور مصائب سے گزر کر مدینہ طیبہ پہنچتے تھے، شوال کا مہینہ شروع ہوا، تو حضرت نے فرمایا کہ میں تو مدینہ طیبہ کئی بار حاضری دے چکا ہوں، معلوم نہیں تم لوگ پھر حاضر ہو سکو یا نہیں، اس لئے مدینہ طیبہ کی زیارت کرا دو۔ شیخ کو یہ کہہ کر کہ "الائمۃ من قریش" قافلہ کا امیر بنا دیا۔ خدا کے فضل و کرم سے راستہ بڑے امن و اطمینان کے ساتھ طے ہوا۔ رفقائے سفر اور عرب جمال، شیخ سے بہت مانوس اور بے تکلف رہے اور انھوں نے بڑی خدمت کی۔ مدینہ طیبہ میں صرف تین دن کا قیام کا ارادہ تھا لیکن بعض غیبی اسباب کی بنا پر ایک ماہ کا قیام رہا، اس زمانہ میں وقت مقررہ سے زائد رہنے پر فی یوم ایک گنی ادا کرنی پڑتی تھی لیکن یہ مدت قیام نہ صرف مفت بلکہ امیر مدینہ کی معذرت کے ساتھ پوری ہوئی۔ اس سفر میں اور بھی غیبی مدد بھی اور عنایات خاص رہیں، جن کے واقعات شیخ اب بھی بڑے لطف اور کیفیت سے بیان فرماتے تھے۔

محرم ۱۳۳۹ھ میں مہارن پور واپسی ہوئی۔

دو نازک امتحان اور توفیق الٰہی

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، شیخ کی ابتدائی تدریس کا زمانہ تھا کہ ایک امتحان پیش آیا۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے شیخ کو ثابت قدم اور راسخ العزم رکھا، ایسے امتحانات اور توفیق الٰہی سے ان میں ثابت قدمی بعض اوقات پورے مستقبل کا فیصلہ کر دیتی ہے اس عالم اسباب میں اس کے بڑے دور رس نتائج نکلتے ہیں، ایک چھوٹا سا واقعہ بعض اوقات زندگی میں حد فاصل کا کام دے دیتا ہے اور بہت سی ترقیات اور فتوحات کا مستحق بنا دیتا ہے۔
شیخ کے خاندان کا تعلق مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے (جو بعد میں مسلم یونیورسٹی

علی گڑھ کے نام سے مشہور ہوا۔) بہت قدیم اور گہرا تھا۔ علی گڑھ تحریک کے بانی سر سید احمد خاں، مولانا نورالحسن صاحب کاندھلوی کے شاگرد تھے۔ اور انھوں نے اس تلمذ کا ہمیشہ بڑا احترام کیا۔ جس کے نتیجے میں اس خاندان کے ذہین اور شریف نوجوان مختلف دوروں میں علی گڑھ کالج سے استفادہ کرتے رہے ان میں بیسویں صدی کی ابتداء میں دو بھائی مولوی بدرالحسن صاحب (جو سب ججی کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے) اور مولوی صدرالحسن صاحب (جو ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز ہوئے۔) خاص طور پر ممتاز و نامور ہوئے۔ شیخ کے اکثر ہم عمر اور قریبی عزیز علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے، مولوی بدرالحسن صاحب نہ صرف علی گڑھ کے اولڈ بوائے[1] تھے بلکہ کالج کے ٹرسٹی اور اس کے اہم ارکان میں سے تھے۔ شیخ کی تنخواہ پندرہ روپے ماہانہ تھی۔ آئندہ کی ترقیات کا بھی حال معلوم تھا۔ والد صاحب کا انتقال ہو چکا تھا۔ خاندان کا معیار زندگی، زمینداری اور اعلیٰ سرکاری عہدوں کی وجہ سے خاصا بلند تھا۔ مولوی بدرالحسن صاحب نے از راہ شفقت یہ منصوبہ بنایا کہ شیخ جن کی ذہانت اور محنت خاندان میں مشہور اور مسلم تھی۔ پرائیوٹ طریقہ پر علوم مشرقیہ کے دو امتحانات دے دیں اس کے بعد کالج میں تین سو روپے کی ملازمت یقینی ہے، خاندان کے بزرگوں کی طرف سے اس بارے میں نہ صرف تائید تھی بلکہ اصرار تھا جو ناراضگی کی حد تک پہونچ گیا تھا۔ لیکن شیخ نے ادب، مگر شدت کے ساتھ اس سے انکار کیا۔ اور فرمایا کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اور اس میں کمی بیشی کا تعلق صرف مقدر سے ہے اگر اللہ کو رزق کی کشائش اور روزی کی فراخی منظور ہے تو یہیں بیٹھے بیٹھے وہ حاصل ہوگی، ورنہ ہزار جتن کرنے کے بعد بھی اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ شیخ کا یہ جواب سن کر خاندان کے ایک بزرگ (مولوی شمس الحسن صاحب) نے جو شیخ کو سمجھانے آئے تھے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور بڑی داد دی۔

اس سے بڑا امتحان چند دنوں کے بعد پیش آیا۔ کرنال میں نواب عظمت علی خاں

---

[1] OLD BOY

مظفر جنگ کے مشہور وقف کی جانب سے ایک بڑا تبلیغی دارالعلوم قائم کیا گیا جس کی خصوصی غرض و غایت یہ بھی کہ اسلام کی تبلیغ اور اس کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے نیز جدید شبہات اور مخالفین اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے جو اس وقت اپنی تبلیغی کوششوں میں سبت سرگرم تھے۔ ایسے فضلاء تیار کئے جائیں جو عربی و انگریزی دونوں سے واقف اور علوم قدیم و جدید دونوں کے جامع ہوں اس کے لئے یہ تجویز ہوئی کہ بڑے وظائف دے کر مستند عربی مدارس کے فضلاء کو انگریزی اور کالجوں و یونیورسٹیوں کے فارغین کو عربی پڑھائی جائے۔ مولانا سر رحیم بخش صاحب مرحوم جو ریاست بہاولپور کے صدر کونسل اور ریجنٹ تھے۔ اس تحریک کے بڑے سرپرستوں میں سے تھے، ان کا تعلق گنگوہ، رائے پور اور سہارنپور سے خادمانہ اور مخلصانہ تھا۔ اور وہ مظاہر العلوم کے بھی سرپرستوں میں تھے۔ انھوں نے ابتدائی مدرس حدیث کے لیے شیخ کا انتخاب کیا اور اس کے لئے سہارنپور کا مستقل سفر کیا۔ ضابطہ کی تین سو ماہانہ کی تنخواہ کے علاوہ انھوں نے زیادہ سے زیادہ سہولتیں دینے کا وعدہ فرمایا۔ مثلاً رمضان کی چھٹی، حضرت کی خدمت میں رہنے کے لیے ہر سال تین ماہ کی چھٹی بلا وضع تنخواہ، احباس کی سہولت، ان سب کے ساتھ ان کی صرف ایک شرط یہ بھی کہ حضرت پر ظاہر نہ ہو کہ یہ تحریک ان کی ہے اس لئے کہ مظاہر العلوم کے ایک سرپرست کی حیثیت سے ان کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ مدرسہ کے مدرس کو کسی اور جگہ کے لیے آمادہ کریں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ ایک دو سال کی چھٹی لے لو اور یہ لکھو کہ قرض کا بار زیادہ ہے۔ شادی بھی ہو چکی ہے اور بچے بھی ہیں، مدرسہ کی تنخواہ میں گذارا نہیں ہوتا۔

اس وقت شیخ کی تنخواہ بیس روپے تک پہونچی تھی۔ مولانا سر رحیم بخش صاحب کے دیرینہ تعلقات، ان کی بزرگانہ مخدومانہ حیثیت، ان کا پرخلوص اصرار، قرض کا بار، تنخواہ کی قلت، اور ترقی کے امکانات کا فقدان، یہ سب وہ "حقائق" تھے جو اس

پیش کش کو قبول کرنے کی ترغیب بھی دیتے تھے اور ان کیلئے شرعی، اخلاقی و علمی دلائل بھی پیش کرتے تھے۔ یہ ایک نوجوان عالم کیلئے جو ذہانت کے جوہر سے آراستہ اور حدیث و ادب میں شہرت یافتہ تھا۔ ایک بڑی آزمائش تھی۔ شیخ اس وقت حقیقتاً ایک دوراہے پر کھڑے تھے۔ اگر وہ اثبات میں فیصلہ کرتے تو ان کی زندگی کا نقشہ ہی دوسرا ہوتا۔ اور آج شاید ان سطور کے لکھنے کی نوبت نہ آتی۔ کہ عرصہ ہوا وہ اسکیم فیل ہو چکی، مدرسہ کا نام و نشان باقی نہیں رہا۔ اس کے لائق مدرسین کچھ تو پیوند خاک ہو گئے اور کچھ گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ نظریہ اسباب ظاہر شیخ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا۔

لیکن توفیق الٰہی نے دست گیری فرمائی اور جس کو شیخ الحدیث کے لقب سے مقبول خاص و عام ہونا تھا۔ اور جس سے خدا کو حدیث کی خدمت، طلبائے علوم دینیہ کی تربیت، اور ایک عالم گیر دینی تحریک (تبلیغ) کی سرپرستی اور مشائخ عصر کی جانشینی کا اہم کام لینا تھا۔ اس کو اس معاملہ میں صحیح فیصلہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی گئی۔ شیخ کے الفاظ ہی میں سنئے، فرماتے ہیں۔ "اس ناکارہ نے مولانا مرحوم سے کہا۔ کہ آپ کے مجھ پر احسانات بہت زیادہ ہیں۔ ان احسانات کے مقابلے میں مجھے آپ سے معذرت کرنی، نہایت ہی نامناسب ہے لیکن اس کے باوجود آپ تو مجھ سے یہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت سے اجازت لوں۔ لیکن آپ کے براہ راست کہنے پر اگر حضرت مجھے حکم بھی فرمائیں تو میں عرض کروں گا کہ اس حکم کی تعمیل سے معذور ہوں۔" عزیمت کا یہ جواب سن کر مولانا رحیم بخش صاحب جو بڑے جوہر شناس اور جہاں دیدہ تھے۔ کبیدہ خاطر نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے جواب کی بڑی قدر کی اور فرمایا کہ میں تمہارا معتقد تو پہلے سے تھا۔ لیکن اس جواب سے میں اور زیادہ معتقد ہو گیا۔

اس کے بعد پھر غالباً کوئی اور ایسا امتحان پیش نہیں آیا۔ اور نہ اس کا کوئی موقع تھا کہ شیخ کی بلند ہمتی، ان کا طرز زندگی، خداداد مقبولیت اور خدا کی مسبب الاسبابی کا

عینی مشاہدہ، جو ہر جانے والے اور ہر آنے والے کو کھلی آنکھوں ہوتا رہتا ہے، کسی کے اندر اس کا خیال بھی نہیں ہونے دیتا کہ ایسا مشورہ دیا جائے یا کوئی ایسی پیش کش کی جائے۔ نوعمری اور مدرسی کے آغاز ہی میں ان کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی ایسے سب لوگوں کو یہ کہہ کر مایوس کر دیتی ہے

بردایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

اور اس کے بعد جب اللہ تعالیٰ کی نصرت اور کفالت کا اور بھی مشاہدہ اور تجربہ ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے مدارج عالیہ سے سرفراز فرمایا اور اپنی محبت و رضا کی دولت سے نوازا تو اب تو زبان حال، امیر خسرو کی زبان میں اس طرح گویا ہے کہ ؎

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

دوسرا سفر حج، حضرت کی رفاقت، اور مدرسہ کی تنخواہ کا معاملہ

۱۳۴۴ھ میں حضرت سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے حج کا قصد فرمایا، اپنی غیر موجودگی میں مدرسہ کا انتظام اس طرح کیا کہ مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب کو مدرسہ کا ناظم اور شیخ کو صدر مدرس مقرر کیا۔ مظاہر العلوم کے صدر مدرس کی ذمہ داریوں اور روایات میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ مختلف شہروں میں ہونے والے ان دینی اور تبلیغی جلسوں میں شرکت بھی کرے، جہاں سے دعوت آئے۔ نیز مدارس کے سالانہ اجتماعات وغیرہ میں بھی شریک ہو۔ شیخ کو سفر سے شروع سے وحشت اور عدم مناسبت تھی۔ یہ معلوم کر کے کہ حضرت نے صدر مدرسی کے لیے ان کو نامزد فرمایا ہے۔ اس عہدے کی جلالت، شان اور

لہ مدرسے کو عربی مدارس میں جمع کی اصطلاح مروج ہے۔

ں کی ذمہ داریوں کے خیال سے شیخ کو فکر پیدا ہوئی، انھوں نے حضرت سے عرض کیا کہ
ضرت "بذل" کے کام کا کیا ہوگا؟ اس کا سلسلہ تو سفر میں منقطع ہو جائے گا، فرمایا ہاں!
ے بھی اس کا خیال ہے۔ عرض کیا کہ میں ساتھ چل سکتا ہوں، اس خدمت کو انجام دوں
۔ فرمایا مصارف سفر کا کیا انتظام ہوگا؟ عرض کیا کہ قرض لے لوں گا! فرمایا! تمہاری
واہیں بھی تو باقی ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے تو یہ اجارہ فسخ کر دیا۔ فرمایا فسخ
ونوں طرف سے ہوتا ہے، تم نے تو فسخ کیا، ہم نے تو منظور نہیں کیا، حضرت کے اس حکم
شیخ نے ان مہینوں کی تنخواہیں وصول کیں، جن کو وصول نہیں کیا تھا، جن کی مجموعی رقم
۹۲ یا ۹۲۲ ہوتی تھی۔ شیخ نے اس حکم کی تکمیل تو کی اور اس سے سفر کا باسانی انتظام ہو گیا
ین حجاز پہنچ کر ایک ہزار کا وصیت نامہ مدرسہ کو بھیجا کہ میری واپسی تک مولوی نصیر
دین صاحب میرے کتب خانہ سے بالاقساط ادا کرتے رہیں۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا، واپسی
شیخ نے یہ حساب مع اس اضافہ کے جو بعد میں ہوا، اور جس کی میزان ۲۷۱۷ (دو ہزار سات
سترہ) روپیہ ہوتی تھی ادا کر دی۔

حج کا یہ سفر اور استاد و مرشد کی مسلسل و ہمہ وقت رفاقت ایک عالی استعداد ا
رنا با محبت و اطاعت مسترشد کے لئے جس کے سفر کا اصل مقصد ہی شیخ کی خدمت و
انت اور استفادہ تھا۔ جیسی روحانی اور باطنی ترقیات اور حصول کمالات کا ذریعہ
ا ہوگی اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ شیخ نے مدینہ طیبہ کے طویل قیام میں بھی حضرت
ا خدمت میں حاضر رہنے "بذل" کی تالیف میں مدد دینے کے علاوہ کسی مشغلہ اور دلچسپی
ے سروکار نہیں رکھا۔ اس مصروفیت اور انہماک کی وجہ سے وہ مسجد نبوی کی حاضری

---

۵ دوران ملازمت میں شیخ کبھی تنخواہ لیتے تھے، کبھی نہیں لیتے تھے، جن مہینوں کی تنخواہیں لیتے تھے ان کے
تعلق بھی یہی نیت تھی کہ واپس کر دیں گے۔

اور بقیع کی زیارت کے علاوہ کہیں آجا نہیں سکے۔ "بذل" کے کام کے علاوہ انھوں نے رغالباً مدینہ طیبہ کی رعایت سے) امام دار الہجرۃ امام مالکؒ کی مشہور و مقبول کتاب "موطا" کی شرح لکھنی شروع کی جو "اوجز المسالک" کے نام سے بعد میں چھ جلدوں میں مکمل ہوئی۔ [۱] مکہ مکرمہ کے قیام میں بھی اگر حضرت نے کسی کتاب کی نقل یا کوئی علمی خدمت سپرد کردی تو شیخ نے اس کی تکمیل کو بھی اپنا وظیفہ اور اپنی ترقی کا ذریعہ سمجھا اور اس میں پورے انہماک سے کام لیا۔

اجازت و رخصت

حضرت سہارن پوری مدینہ طیبہ میں مستقل قیام کے ارادے سے گئے تھے، آپ کا واپسی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ رفقائے خاص کو اس کا علم تھا۔ کہ آپ تو یہاں بقیع میں آسودہ خاک ہونے کے لئے آئے ہیں، مدرسہ کا شیرازہ کو مجتمع رکھنے اور اس دور پرفتن کے آفات و شرور سے اس کو الگ رکھنے کے لیے نیز ارشاد و تربیت کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے جو حضرت کی ذات سے وابستہ تھا شیخ کی واپسی ہندستان ہی کو مناسب تھی۔ مولانا سید احمد صاحب مدنی [۲] نے اپنے مدرسہ شرعیہ کے لئے شیخ کو روکنے کی بڑی کوشش فرمائی ان کا اصرار تھا کہ واپس نہ جائیں۔ وہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس کرایہ کی رقم بھیج دیں گے تاکہ وہ شیخ کے متعلقین کو مدینہ طیبہ پہونچا دیں۔ لیکن حضرت سہارنپوری نے مظاہر العلوم کی اہمیت کے پیش نظر اس کو قبول نہیں فرمایا۔ بلکہ شیخ کے لئے "شیخ الحدیث" کے عہدے اور "نائب ناظم" کے منصب کی تحریر لکھ کر دیدی جس پر شیخ نے بڑی عرض و معروض

---

[۱] شیخ فرماتے ہیں کہ اس کی تصنیف کا کام مواجہہ شریف کے قریب ہوتا تھا اور جتنا حصہ مدینہ طیبہ کی مختصر مدت قیام میں لکھا گیا وہ ہندستان کے مہینوں اور برسوں کے قیام میں کبھی نہ ہو سکا۔

[۲] برادر اکبر حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی و بانی مدرسہ علوم شرعیہ، مدینہ منورہ

کی آخر میں حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری کو بیچ میں ڈالا، مولانا نے ایک لطیف عنوان سے خدمت میں عرض کر کے "نائب ناظم" کی ذمہ داری سے ان کو سبکدوش کرا دیا۔ "شیخ الحدیث" کے منصب کے لئے حضرت نے اپنے دست مبارک سے تحریر لکھ کر کتاب میں رکھ دی اور ایسا انتظام فرمایا کہ شیخ کی نظر اس پر پڑ جائے۔

رخصت کرنے سے پہلے چاروں سلسلوں میں بیعت وارشاد کی عام اجازت عطا فرمائی اور اس کے لئے بڑا اہتمام فرمایا۔ اپنے سر سے عمامہ اتار کر مولانا سید احمد صاحب کو دیا کہ شیخ کے سر پر باندھیں۔ جس وقت وہ عمامہ شیخ کے سر پر رکھا گیا۔ شیخ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ چیخیں نکل گئیں۔ حضرت بھی آبدیدہ ہو گئے ــــ شیخ نے بعض مکتوبوں میں فرمایا کہ عمامہ رکھتے ہی مجھے اپنے اندر کوئی چیز آتی ہوئی محسوس ہوئی اس سے میں سمجھا انتقال نسبت کی شاید یہی حقیقت ہے۔ شیخ نے اس اجازت کو بہت پوشیدہ رکھا اور شاید عرصہ تک ہندستان میں اہل تعلق کو اس کا علم نہ ہوتا لیکن حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تشہیر کر دی پھر بھی عرصہ تک بیعت لینے سے انکار کرتے رہے۔ لیکن عم معظم مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے حکم سے اس کا سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے خاندان کی چند بیبیوں نے بیعت کی درخواست کی، شیخ نے حسب عادت انکار و معذرت کی۔ انھوں نے مولانا محمد الیاس صاحب سے عرض کیا۔ مولانا نے شیخ کو سمجھایا اور حکم دیا کہ وہ بیعت کریں۔ شفقتاً اپنا عمامہ بھی سر پر رکھ دیا۔ رفتہ رفتہ اہل صلاح اور اہل علم کا رجوع ہوا۔ اور وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔

حجاز سے واپسی اور سہارن پور کے مشاغل

حجاز سے واپسی پر آپ ہمہ تن تدریس و تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ واپسی کے بعد سے ابوداؤد کا درس بھی آپ ہی کے پاس آ گیا۔ "بذل" کی ترتیب میں شریک رہنے اور حضرت سہارن پوری کے خصوصی توجہ کی وجہ سے اس کی تدریس میں قدرتی طور پر آپ کو

امتیاز حاصل تھا۔ "اوجز" کی تالیف کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ حضرت گنگوہی اور والد ماجد کی تحقیقات و تقریرات کی اشاعت کا بھی شغل رہتا تھا اس کے علاوہ دینی و تبلیغی رسائل جو زیادہ تر بزرگوں و سرپرستوں بالخصوص عم بزرگوار حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ارشاد و تاکید سے لکھے گئے، تحریر میں آتے رہے۔

ان تدریسی و تصنیفی مشاغل کے علاوہ مدرسہ کے انتظام میں آپ شریک غالب اور مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب کے قوت بازو اور دست راست تھے۔ بحث طلب مسائل و امور میں اکثر آپ ہی کی رائے فیصلہ کن اور قطعی ہوا کرتی تھی۔ پھر مشائخ عصر اور اکابر سلسلہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی، مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ، حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی، حضرت حافظ فخر الدین صاحب پانی پتی اور شاہ محمد یٰسین صاحب نگینوی سب کی بکثرت آمد و رفت رہتی تھی۔ اور آپ کے معتمد علیہ، محبوب، مشیر اور محرم راز تھے اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو فطری جامعیت، اعتدال و توازن اور بے ہمہ اور باہمہ کی صفت عطا فرمائی ہے اس کی وجہ سے آپ کی ذات اور آپ کا مستقر سب کا مرکز اور سب کے لیے "نقطۂ جامعہ" تھا اور کلیات سے لے کر جزئیات تک آپ اکثر مشیر و دخیل رہتے۔

اس سب کے ماسوا مہمانوں کا ہجوم جو اس مقبولیت کا قدرتی نتیجہ تھا واردین و صادرین کی کثرت اور دستر خوان کی وسعت بڑھتی چلی گئی اور اس نے آپ کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ کیا یہاں تک کہ وہ آپ کا ایک ایسا امتیاز بن گیا اور اس نے ایک ایسی شہرت حاصل کر لی جو بہت سے لوگوں کے لیے موجب حیرت ہے۔ مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب کی وفات کے بعد جو ایک کہن سال اور تجربہ کار مخلص اور مستعد ناظم تھے، مدرسہ کے انتظام اور انصرام اور اس کی بقا و قیام کا سب سے بڑا بوجھ آپ پر پڑ گیا۔ اگرچہ حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب سابق صدر مدرس اپنے علم و فضل

اور اخلاص وللہیت کی بنا پر مدرسہ کے قدیم شیوخ واکابر اور ذمہ داروں کے صحیح جانشین ہیں اور ان کا وجود مدرسہ کے لئے ایک بڑی نعمت ہے لیکن ان کے گوناگوں امراض، بڑھتی ہوئی معذوری اور طبعی ضعف کی بنا پر شیخ کو مدرسہ کے نظم ونسق اور جزئیات کلیات کے لئے خاصا وقت دینا پڑتا ہے اور ان کی ذات، ان کی قوت فیصلہ اور ان کا شخصی اثر ہی مدرسہ کی پشت پناہ ہے۔

ادھر خدا کا ان کے ساتھ خاص معاملہ یہ ہے کہ جو شیخ دنیا سے جاتا ہے وہ اپنے مسترشدین ومتعلقین کو یا تو خود شیخ کے سپرد کر جاتا ہے یا وہ خود کسی اشارہ غیبی سے یا اس یگانگت واعتماد کی بنا پر جو ان کے شیخ ومربی روحانی کو شیخ پر تھا وہ سب شیخ کی ذات ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور بالعموم شیخ سے اپنی تکمیل وتربیت اور مشورہ ورہبری کا کام متعلق کر دیتے ہیں۔ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معاملہ تو گھر ہی کا تھا لیکن اس سے پہلے مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی اور ان کے بعد مولانا علی پھر مولانا رائے پوری اور سب کے آخر میں مولانا محمد یوسف صاحب کی وفات کے بعد ان سب حضرات کے اکثر اہل ارادت اور اہل تعلق نے شیخ ہی کو اپنا روحانی سرپرست، مرشد ورہنما اور اپنے مشائخ کا جانشین اور وارث وامین سمجھا پھر خصوصیت کے ساتھ مولانا محمد یوسف صاحب کی رحلت کے بعد تبلیغی حلقہ کا جس نے اب عالمگیر شکل اختیار کر لی ہے اور ہندوستان سے متجاوز ہو کر ایک طرف مراکش اور دوسری طرف انڈونیشیا تک اور یورپ وامریکا تک پھیل گیا ہے، آپ ہی مرجع اور مرکز بن گئے، اس سلسلے کو باقی رکھنے، اس کو زمانہ کے خطرات اور اس دور کے فتنوں سے بچانے اس کے مسلک اور اصول کی حفاظت اس کے سرگرم کارکنوں کی دینی نگرانی روحانی تربیت وتکمیل کی ساری ذمہ داری اور نظام الدین کے مرکز اور اس کے ذمہ داروں کی سرپرستی کا پورا بوجھ آپ ہی کے کاندھوں پر پڑ گیا ہے۔ اسی کے ساتھ جتنا جتنا یہ حلقہ وسیع ہوتا جا رہا ہے کام کی مقبولیت بڑھ

رہا ہے۔ مشائخ کبار اٹھتے جارہے ہیں اور آپ کی مرجعیت و مرکزیت و ذمہ داریوں میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اور ملک کے اندر و باہر سے آنے والی جماعتوں اور وفود کی آمد و رفت بھی بڑھ رہی ہے۔ اور اسی کے مطابق آپ کی مشغولیت اور ضیافت و تواضع کا دامن بھی وسیع ہوتا چلا جارہا ہے یہاں تک کہ اب اگر کوئی ناواقف یا نو وارد ان مہمانوں کی کثرت اور دستر خوان کی وسعت دیکھے تو یہ سمجھے گا کہ آج کوئی بات ہے اور کوئی عظیم تقریب یا غیر معمولی مہمانداری ہے۔ حالانکہ یہ روزمرہ کا واقعہ ہے۔ اور اس میں کسی دن کوئی خصوصیت نہیں۔

تیسرا حج

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا شیخ کو سفر سے طبعی عدم مناسبت بلکہ ایک طرح کی وحشت ہے۔ ان کے لئے دہلی جانا تو بڑی چیز ہے، رائے پور اور دیوبند تک جانا بھی مجاہدۂ عظیم بن گیا ہے اور بارہا ایسا ہوا ہے کہ سفر کے ارادہ سے ان کو حقیقتاً بخار آگیا ہے اور واپسی پر تو اکثر کئی کئی دن تک صحت اور اعصاب پر اثر رہا ہے۔ ایسی حالت میں حج کا سفر خواہ کتنی ہی سہولت و اہتمام کے ساتھ ہو ان کے لئے ایک بڑا امتحان اور ایک شدید مجاہدہ تھا ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ شاید ۱۳۴۴ھ کا حج آخری حج ثابت ہوگا لیکن دفعتاً غیب سے ایک سامان پیدا ہوا۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب نے جن کی ہستی اب ان کے لئے عزیز ترین ہستی اور جن کا ایما اور خواہش ان کے لئے سب سے زیادہ قابل لحاظ اور قابل رعایت تھی ۱۳۴۴ھ میں رفقاء اور خدام کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ حج کا عزم فرمایا اور شیخ سے معیت و رفاقت کی درخواست کی، یہ درخواست ایسے جزم و اصرار اور ایسی محبت و خلوص سے تھی کہ شیخ کے لئے معذرت و انکار ممکن نہیں رہا۔ قابل فخر اور سرمایہ نازش بھائی کا پُرمحبت اصرار دیارِ حبیب ﷺ کی حاضری حج و زیارت کی سعادت جس کے شوق اور عشق کی چنگاریاں ہمیشہ سینے میں دبی اور سلگتی رہیں۔ بقول شاعر ؎

اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

آپ نے رفاقت منظور کرلی اور بجلی کی طرح یہ خبر سارے ہندستان اور پاکستان
میں پھیل گئی کہ مولانا محمد یوسف صاحب کے ساتھ شیخ بھی حج کو جا رہے ہیں۔ ہر
طرف سے شمع حرم کے پروانوں کا ہجوم اور شیخ سے جو لوگ ارادت اور عقیدت کا
تعلق اور تبلیغی جماعت سے محبت و رفاقت کا رشتہ رکھتے تھے۔ ان کی بڑی تعداد
اس زریں موقعہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے تیار ہو گئی۔ یہ ایک تاریخی سفر تھا جس
کی تفصیل مولانا محمد یوسف صاحب کی سوانح و حالات میں اپنی جگہ پر آئے گی ـــ
۱۷ ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ کو سہارن پور سے روانگی ہوئی، چار ماہ کے عرصہ میں پاکستان
ہوتے ہوئے وسط ربیع الاول میں سہارن پور واپسی ہوئی۔ واپسی کے سفر میں کراچی
لاہور، سرگودھا اور ڈھڈیاں ایک ایک دو دو دن ٹھہرنا ہوا۔ پاکستان کے مہجور و محروم
عقیدت مندوں نے جو سالہا سال سے زیارت کو ترس رہے تھے اس موقعہ کو نعمت
خداداد تصور کیا۔ شیخ کا مستقل سفر پاکستان نہایت دشوار اور بعید از قیاس تھا۔
سفر حج کی برکت سے ان دور افتادہ خدام و محبین کی قسمت جاگ اٹھی۔ انھوں نے
پروانوں کی طرح ہجوم کیا۔ ایک طرف مولانا محمد یوسف صاحب کی کشش، دوسری طرف
اس نعمت سے فائدہ اٹھانے کا شوق، سینکڑوں، ہزاروں آدمیوں کو درمیانی
اسٹیشنوں پر کھینچ کھینچ کر لاتا، ایرکنڈیشن گاڑی میں ہونے کے باوجود ساری رات
جاگ کر سراپا اشتیاق محبین کو مصافحہ و ملاقات کا موقع دیتے اور گرمی و لو کی پرواہ
نہ کرتے۔ شیخ کو ڈھڈیاں جاکر حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے
اور کچھ وقت وہاں گزارنے کا بڑا شوق تھا اور جیسا کہ بعض خاص مجلسوں میں فرمایا
کہ پاکستان کا سفر ہی خاص اسی شوق میں کیا گیا تھا۔ سرگودھا پہونچے تو سخت گرمی
تھی، دونوں طرف برف کی سلیں رکھی جاتیں اور پنکھا چلتا رہتا۔ خدام نے ڈھڈیاں کے

پروگرام ملتوی کرنے کی بار بار درخواست کی کہ وہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ نہ وہاں بجلی ہے نہ برف کا انتظام ہو سکتا ہے لیکن شیخ نے کسی طرح اس کو منظور نہیں کیا، خدا کی قدرت کہ وہاں پہونچتے ہی موسم ایسا تبدیل ہوا کہ کسی چیز کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بلکہ رات کو کپڑا اوڑھنے کی ضرورت پڑ گئی، جب تک قیام رہا ایسا ہی خنک و خوشگوار موسم رہا، فرماتے تھے کہ حضرت کو زندگی میں میرا قرآن شریف سننے کا بڑا شوق تھا لیکن اس کی نوبت نہ آئی، میں نے وہاں قبر مبارک کے پاس پورا قرآن مجید ختم کرنے کا اہتمام کیا۔

چوتھا حج

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ایک سال خالی گیا اگلے سال (۱۳۸۶ھ) ۱۹۶۷ء حجاز میں کام کرنے والوں کا تقاضا ہوا کہ حجاز نیز بیرونی ممالک میں کام اور کام کرنے والوں کی ضرورت و مصلحت کا اقتضا ہے کہ مولانا کے جانشین اور تبلیغی دعوت کے موجودہ ذمہ دار مولانا انعام الحسن صاحب اپنے خاص رفقاء کے ساتھ اس سال حج کو آئیں تاکہ دعوت میں نئی طاقت اور استحکام اور مزید وسعت و عمومیت پیدا ہو، بڑے غور و خوض اور حالات و ضروریات کا جائزہ لینے کے بعد حضرت شیخ الحدیث کے مشورہ اور تائید سے اس کو منظور کر لیا گیا۔ یہ مولانا انعام الحسن صاحب کا مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے بعد اور ان کے بغیر حج کا پہلا سفر تھا۔ جس میں ہندوستان پاکستان کے علاوہ اسلامی و غیر اسلامی ممالک کے بکثرت رفقاء احباب و کارکن اور علماء و خواص کا اجتماع متوقع تھا۔ قدرتاً مولانا انعام الحسن صاحب کی طبیعت پر اس سفر کی اہمیت اور اپنی تنہائی کا احساس غالب تھا۔ اور ان کا قلبی و طبعی تقاضا تھا کہ حضرت شیخ الحدیث کی معیت ان کے لئے اس عظیم سفر میں تقویت و طمانیت کا موجب ہو، دوسری طرف حجاز کے اہل تعلق اور جماعت کے رفقاء

اور کارکنوں کے پیہم خطوط اور متواتر تقاضے آ رہے تھے کہ شیخ اس سفر میں ضرور ساتھ ہوں۔ حجاز و پاکستان کے اہل تعلق کو صرف اسی سفر کے بہانے اور اسی سفر کی تقریب سے زیارت و صحبت کا موقع مل سکتا تھا۔ شروع میں جماعت کے نظم و نسق کی نگرانی اور مولانا انعام الحسن صاحب کے باہر چلے جانے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوتا تھا اس کے پیش نظر شیخ الحدیث کا نہ جانا سہارنپور ہی میں طے کر دیا گیا اور اس کی اطلاع بھی دے دی گئی لیکن جوں جوں مولانا انعام الحسن صاحب کی روانگی کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی سارے ہندوستان میں شیخ کے جانے کی خبر بھی گرم ہو رہی تھی اور استفسار کی خطوط کا تانتا بندھ رہا تھا۔ اور مقررہ تاریخ پر دہلی اور بمبئی زائرین اور رخصت کرنے والوں کے پہونچنے کی اطلاعیں آ رہی تھیں۔ بالآخر ۱۹ر فروری ۱۹۶۷ء کو شیخ دہلی تشریف لے آئے۔ اور ابھی تک روانگی طے نہ تھی۔ کسی وقت جانے کی خبر گرم ہو جاتی تھی اکسی وقت نہ جانے کی۔ راقم السطور مولانا محمد منظور صاحب اور مولانا معین اللہ صاحب ندوی رخصت کرنے کی نیت سے ۲۰ر فروری کو دہلی پہونچے۔ شیخ نے فوراً یاد فرمایا اور تخلیے کا حکم دیا۔ اس وقت صرف مولانا انعام الحسن صاحب مولانا منظور صاحب اور یہ ناچیز تھا۔ شیخ نے اپنے ذہنی کشمکش اور تردد کا اظہار فرمایا۔ اور بعض غیبی اشارات و مبشرات دوستوں کے انتظار و اشتیاق سفر کے محرکات اس کے مقابلے میں قیام کے اسباب و موجبات کا ذکر فرماتے ہوئے رائے طلب کی ہم لوگوں نے قیام کا رجحان ظاہر کیا۔ اور اس کے مصالحہ عرض کئے۔ شام تک کوئی ایک پہلو غالب اور قطعی نہیں معلوم ہوتا تھا۔ رات کو جب سعودی سفیر محمد الحمد الشبیلی ملنے کے لیے تشریف لائے اور اس موقع پر مجلس خاص میں حاضری ہوئی تو جانے کا فیصلہ معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ یہ اندازہ ہو گیا کہ سفر طے ہو گیا ہے۔ ملاقات اور رخصت کرنے والوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ نظام الدین میں ایک جگہ سے

دوسری جگہ آنے جانے اور شیخ تک پہونچنے میں ہزار دقتیں معلوم ہوتی تھیں، اوپر نیچے سب بھرا ہوا تھا۔ عشا کے وقت سے کھانا کھلانے کا جو سلسلہ شروع ہوا تو آخری قسط نے فجر کے وقت کھانا کھایا۔ تعداد سینکڑوں سے متجاوز تھی۔ صبح نماز فجر کے بعد ہوائی اڈے کے لیے رخصت ہوئے، بعض اسباب و قرائن کی بنا پر بہت سے خواص کو اندیشہ تھا کہ اب واپسی نہیں ہوگی۔ ہوائی اڈے پر بھی ایک بڑا مجمع رخصت کرنے کے لئے پہونچ گیا، بعض خدام نے ہندستان کی خصوصیات اور مسلمانوں کے مخصوص حالات کی بنا پر واپسی کی مخلصانہ درخواست اور اس کی تمنا کا اظہار کیا، نو بجے کے قریب وہاں سے بمبئی کے لیے پرواز ہوئی۔ ۲۱، ۲۲ بمبئی قیام رہا اس مرتبہ مدرسہ رحمانیہ واقع مدنپورہ میں قیام تھا۔ ۲۳ کو براہ راست بمبئی سے جدہ کو پرواز ہوئی اور اسی روز مع الخیر وہاں پہونچ گئے۔ سفیر ہند جناب مدحت کامل قدوائی صاحب نے جدہ کے ہوائی اڈے پر استقبال کیا اور اپنے ہی ساتھ اپنے مکان پر لے گئے۔ وہاں کھانا کھایا وہاں سے تھوڑی دیر کے بعد مولوی محمد تمیم صاحب وغیرہ کی معیت میں مکہ معظمہ حاضری دی، مکہ معظمہ میں قیام حسب سابق مدرسہ صولتیہ میں تھا۔ وہاں کا نظام الاوقات ایک اہم مکتوب سے نقل کیا جاتا ہے۔

"اس سے پہلے سفر میں صحت بھی بہ نسبت پہلے کے اچھی تھی۔ اور مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وجہ سے موٹریں بھی ہر وقت کئی کئی موجود رہتی تھیں اس لئے سابقہ سفر میں صبح کی نماز حرم شریف میں ہوتی تھی۔ اور اگر کسی دن تاخیر ہو جاتی تو نماز مدرسہ کی مسجد میں پڑھ کر مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ فوراً حرم جاتے اس لئے کہ نماز کے بعد تین گھنٹے کی تقریر مولانا یوسف صاحب کی ہی ہوتی تھی۔ شیخ الحدیث بھی ساتھ تشریف لے جاتے تھے۔ اور مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی تقریر بھی سنتے تھے اس کے بعد قیام گاہ پر مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے

ساتھ چائے کا وسیع دسترخوان لگتا تھا۔ جس میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا اور جملہ حاضرین پر چائے کے ساتھ ساتھ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی شدید گرفت بھی رہتی تھی۔ امسال صبح کی تقریر تقریباً ڈھائی گھنٹے مولانا محمد عمر صاحب یا مولانا سعید خاں صاحب کی ہوتی۔ حضرت شیخ الحدیث اپنے امراض اور ضعف اور سواری کی عدم فراوانی کی وجہ سے مدرسہ کی مسجد میں نماز ادا فرماتے، اس کے بعد قیام گاہ پر ذاکرین کے ذکر کا سلسلہ بحمد اللہ زور و شور سے رہتا ہے۔ جس کی پہلے سفر میں نوبت نہ آسکی تھی اس کے بعد ایک بجے (عربی وقت سے) حضرت شیخ الحدیث اپنی تنہا چائے نوش فرماتے ہیں مولانا انعام الحسن صاحب اور مولوی ہارون صاحب اس وقت تک اپنے کمرے میں آرام کرتے رہتے ہیں اور اپنی چائے اپنے کمرے ہی میں پیتے ہیں۔ اس کے بعد وہ دونوں اور حرم کے اجتماع والے خواص مولانا محمد عمر وغیرہ حضرت شیخ الحدیث کے کمرے میں آجاتے ہیں۔ اور تین بجے تک مختلف مسائل پر گفتگو رہتی ہے۔ تین بجے سے پانچ بجے تک حضرت شیخ الحدیث نے مختلف احباب کی ملاقات کے لیے وقت رکھا ہے۔ اسی دوران میں مدرسہ کی مسجد میں خصوصی حجاج کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ آج ہندستان و پاکستان کے علماء کا اجتماع ہے، کل افغانیوں کا تھا۔ اس سے پہلے الجزائر وغیرہ کے مختلف اجتماعات ہوتے رہے ہیں۔ ان میں حضرت شیخ کی بھی شرکت تھوڑی دیر کے لئے ہو جاتی ہے اور مولانا انعام الحسن صاحب بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اسی وقت ان حضرات کی اپنی تعلیم بھی مدرسہ کے دوسرے کمرے میں ہوتی رہتی ہے۔ حضرت شیخ کی طبیعت پہلے سے بھی ناساز تھی۔ یہاں آکر کچھ حرارت کا سلسلہ بھی مسلسل سا ہو گیا۔ اور اس سے زیادہ پیشاب کا سلسلہ

بھی بے قابو ہو گئی۔ شاید اس میں زمزم کو بھی دخل ہو، اس لئے کہ یہاں
آنے کے بعد اس وقت تک زمزم کے علاوہ دوسرا پانی بجز اس کے کہ جو بوتل میں
ملا ہوا ہوتا ہے نوبت نہیں آتی۔ ظہر کی نماز ساڑھے چھ بجے ہوتی ہے۔ ظہر سے متصل
کھانے سے فراغت کے بعد عصر تک قیلولہ ہوتا ہے۔ عموماً کھانے میں ایک گھنٹہ لگ
جاتا ہے لیکن دعوت کے دن جو اکثر ہوتی رہتی ہے قیلولہ میں ہی دیر ہو جاتی ہے
اگرچہ کھانے کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا، دعوت اپنے مستقر پر ہی ہوتی ہے۔
عصر ساڑھے نو بجے عموماً ہوتی ہے، اس کے بعد حضرت شیخ نے قہوہ شروع کر دیا
تھا جو اچھا معلوم ہوتا مگر اس سے نیند پر اثر پڑنے لگا اس لئے بجائے اس کے
سبز چائے شروع کر دی۔ اس دوران میں احباب بھی آتے رہتے ہیں۔ ۱۱ بجے
سے حرم کی تیاری کے بعد ساڑھے گیارہ بجے سے ڈھائی بجے تک حرم میں قیام رہتا ہے
اس دوران میں ان حضرات کے یہاں خصوصی ملاقاتیں، عمومی اجتماعات، اردو کے
مختلف حلقے اور عربی کے مختلف حلقے ہوتے رہتے ہیں، دوسری زبانوں کے حلقے،
افغانی، ترکی، انگریزی وغیرہ میں ہوتے رہتے ہیں۔ اور حکومت کی طرف سے مطالبات
بھی اللہ کا شکر ہے کہ ابھی تک نوبت نہیں ہے۔ حضرت شیخ الحدیث پیشاب کی
کثرت کی بنا پر ایک گوشے میں تشریف فرما ہوتے ہیں۔ ڈھائی بجے واپسی کے بعد
تمام حضرات کھانا کھاتے ہیں۔ اور حضرت شیخ کچھ میوے تناول فرماتے ہیں۔
۴ بجے حضرت شیخ مخصوص حضرات کے ساتھ حرم میں دوبارہ حاضر ہوتے ہیں
اور گاڑی پر بسبب معذوری کی وجہ سے تین چار طواف کرتے ہیں۔ چھ بجے حرم
سے واپسی پر حضرت شیخ آرام فرماتے ہیں اور دس بجے تہجد کی اذان اور گیارہ بجے
کے قریب صبح کی نماز ادا ہوتی ہے۔

حج سے فارغ ہو کر اور مکہ معظمہ میں معتد بہ قیام کر کے مدینہ طیبہ روانگی ہوئی وہاں سے

۲۲ر اپریل کو مکہ معظمہ آمد ہوئی۔ دو دن وہاں قیام کے بعد جدہ اور ۲۶ر کو جدہ سے
کراچی وہاں سے ۲۸ر کو دہلی روانگی ہوگئی۔ وہاں حسب توقع استقبال کرنے والوں کا
ہجوم تھا، جمعہ اور سنیچر دہلی قیام کرکے یکشنبہ ۳۰ر اپریل کو دس بجے کے قریب سہارنپور
تشریف لائے۔ کچے گھر میں وضو فرماکر مسجد تشریف لے گئے اور دوگانہ ادا فرمانے کے
بعد مجمع سے مصافحہ فرمایا۔ اعزہ اقربا اور خواص کسی سے بھی نماز سے قبل مصافحہ نہیں کیا
اسی وقت بعد نماز عصر دعا کا اعلان ہوا، چنانچہ دار الطلبہ جدید کی مسجد میں مولانا انعام الحسن
صاحب نے دعا کرائی جس میں شہر اور مضافات کے لوگوں نے شرکت کی۔ دوشنبہ کو صبح
چائے کے بعد ہر دو حضرات مع بعض حضرات گنگوہ تشریف لے گئے اور کھانے کے
وقت تک لوٹ آئے، ظہر کے بعد مولانا انعام الحسن صاحب تو نظام الدین واپس آگئے
اور حضرت شیخ نے بخاری شریف کا درس شروع کرادیا۔

شیخ کے معمولات و نظام اوقات

شیخ کی زندگی اپنے علمی انہماک، خدمت خلق، یکسوئی اور شدید مصروفیت کے اعتبار
سے اس بیسویں صدی میں ان علمائے سلف کی زندہ یادگار ہے جن کا ایک ایک لمحہ
عبادت و خدمت اور علم کی نشر و اشاعت کے لئے وقف تھا لہٰذا جن کے کارنامے
دیکھ کر ان کے اوقات کی برکت، ان کی جفاکشی اور بلند ہمتی اور ان کی جامعیت کے سامنے
آدمی تصویر حیرت بن کر رہ جاتا ہے اور ان کی روحانیت تائید الٰہی کے سوا اس کی کوئی
توجیہ نہیں ہو سکتی۔

فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد[1] کچے گھر میں[2] تشریف لے آتے ہیں۔ اور ایک بڑی جماعت

[1] اس وقفہ میں اب روز بروز طول ہوتا جارہا ہے۔ پہلے فجر کی نماز کے کچھ ہی دیر بعد تشریف لے
آتے تھے، اب دیر تک تلاوت و وظائف میں مشغول رہتے ہیں۔ سوائے ان خاص موقعوں کے کوئی خاص
مہمان آیا ہو۔ [2] شیخ کا مکان اسی نام سے مشہور ہے۔

کے ساتھ چائے نوش فرماتے ہیں. جن کی تعداد پچاس ساٹھ سے شاید کبھی کم ہوتی ہو.
بعض دنوں میں اس سے بہت بڑھ جاتی ہے. کچھ لوگوں کے لئے ناشتہ کا بھی انتظام ہوتا
ہے لیکن اس وقت شیخ کا معمول صرف چائے پینے کا ہے، اگر کوئی ایسا عزیز اور اہم مہمان
ہوتا ہے جو تھوڑے وقت کے لئے سہارنپور آیا ہوتا ہے یا اس سے کوئی ضروری باتیں
کرنی ہوتی ہیں تو تخلیہ کر لیا جاتا ہے. اور کچھ دیر وہیں تشریف رکھتے ہیں. پھر بالا خانہ پر
اپنے علمی و تصنیفی معمولات پورا کرنے کے لئے تشریف لے جاتے ہیں. جاڑے گرمی، برسات
حوادث تحریکات اور کسی بڑے سے بڑے معزز مہمان کی آمد کے موقعہ پر بھی اس میں کمتر فرق
واقع ہوتا ہے. بعض مرتبہ فرمایا کہ حضرت رائے پوری یا ایسے اکابر و مشائخ کی تشریف
آوری کے موقع پر میں نے احتراماً اپنا یہ معمول ترک کر دینا چاہا تو سر میں درد ہو گیا۔
اجازت لے کر تھوڑی دیر کے لئے گیا اور تھوڑا سا کام کر کے واپس آ گیا. اکثر یہ حضرات
خود ہی باصرار شیخ کو رخصت فرما دیتے اور حرج گوارا نہ فرماتے، اوپر کی نشست گاہ
دیدنی ہے نہ کہ شنیدنی. ایک چھوٹا سا کمرہ جس میں کتابوں کا اس طرح ذخیرہ ہے گویا
در و دیوار اسی کے ہیں. ان کتابوں کے درمیان بمشکل ایک آدمی کے بیٹھنے کی جگہ ہے.
جس میں شیخ تشریف رکھتے ہیں. وہ جب اپنی جگہ پہونچ جاتے ہیں اور ان کتابوں کے
درمیان "پناہ" لیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پرندہ جو دن بھر غیر جنس میں
رہا ہے اپنے آشیانہ میں واپس آ گیا ہے. اس وقت ان کا وہی حال ہوتا ہے.
جس کی تصویر خواجہ میر درد نے اس شعر میں کھینچی ہے ؎

جائیے کس واسطے اے درد میخانہ کے بیچ
کچھ عجب مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

اگر کسی کو اس وقت کوئی ضروری بات کہنے کے لئے یا کسی عزیز مہمان کو ملنے کے
لئے جانا پڑتا ہے تو اس کو بمشکل بیٹھنے کی جگہ ملتی ہے. چاروں طرف کتابوں کا ڈھیر ایک

آدھ جھڑا یا چٹائی کا فرش، کچھ پرانی شیشیاں اور دواؤں کی بوتلیں، گرد جس میں معلوم
نہیں کتنا علم کا جوہر اور اخلاص کی تب و تاب ہوتی ہے۔ ۱۱½ بجے تک شیخ پوری یکسوئی
کے ساتھ وہاں کام کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کا جی چاہتا ہے کہ سوائے ضروری اور
فوری کاموں کے خلل واقع نہ ہو۔ ان اوقات میں ان خاص مہمانوں اور ذکر و شغل کرنے
والے عزیزوں کو اجازت ہوتی کہ صحن میں بیٹھ کر ذکر جہر کرتے رہیں۔ وہ کام میں مشغول
رہتے ہیں۔ اور اس سے شیخ کی یکسوئی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

ساڑھے گیارہ بجے نیچے تشریف لے آتے ہیں دسترخوان بچھتا ہے۔ مہمانوں کی
جماعت کثیر شریک طعام ہوتی ہے۔ عام طور پر دو اور تین مرتبہ مجمع بیٹھتا ہے۔ شیخ کی
اصطلاح میں اس کو پہلی پیڑھی اور دوسری پیڑھی کہتے ہیں۔ شیخ اول سے آخر تک کھانے
میں شریک رہتے ہیں۔ اپنے کھانے کی رفتار اور مقدار ایسی رکھتے ہیں کہ آخری کھانے
والے تک کا ساتھ دے سکیں۔ کھانے میں بالعموم تنوع ہوتا ہے۔ متعدد قسم کے سالن وافر
مقدار میں ہوتے ہیں۔ اور بڑے اصرار سے مہمانوں کو کھلایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ نو وارد
ناتجربہ کار بعض اوقات اس اصرار سے اپنے معمول سے زیادہ کھا کر تکلیف بھی اٹھاتے
ہیں لیکن غور سے دیکھنے والا معلوم کر لیتا ہے کہ شیخ برائے نام شریک ہیں۔ ان کی خوراک
اتنی کم ہوتی ہے کہ اس مقدار کے ساتھ اتنی محنت پر تعجب ہوتا ہے۔ لیکن دسترخوان پر
وہ ایسا سماں باندھتے ہیں کہ کسی کو پتہ نہیں چلنے پاتا۔ کہ کریم النفس اور فراخدل میزبان
خود کس قدر اس کھانے میں شریک ہے۔

کھانے سے پہلے ڈاک آ جاتی ہے جس پر ایک سرسری نظر ڈال لیتے ہیں۔ اس ڈاک
کی مقدار روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ان سطور کی تحریر کے زمانہ میں ۳۰/۴۰ (تیس چالیس)
کے درمیان روزانہ خطوط کا اوسط ہے۔

کھانے کے بعد شیخ آرام کرنے کے لئے مضطر ہوتے ہیں۔ ۱۲½ یا ایک اس میں

ضرور بج جاتا ہے۔ یہی وقت ان کے آرام کا ہے۔ ظہر کے بعد ایک گھنٹہ وہ ڈاک اور اسی درمیان میں کسی عزیز مہمان سے گفتگو کی نذر کرتے ہیں۔ گھنٹہ ختم ہونے کے بعد حدیث کے درس کے لئے تشریف لے جاتے ہیں۔ پہلے یہ درس دارالطلبہ کے دارالحدیث میں ہوتا تھا۔ جو بالائی منزل پر ہے۔ اب چڑھنے بلکہ چلنے تک کی معذوری کی بنا پر دارالطلبہ کی مسجد میں ہوتا ہے۔ مولانا حافظ عبداللطیف صاحب کی وفات کے بعد سے بخاری شریف آپ ہی پڑھاتے ہیں۔ اس درس کی کیفیت بھی دیدنی ہے نہ کہ شنیدنی حدیث کے احترام میں سنت کے شغف اور ذات نبوی سے عشق کی کیفیت کا اثر تمام حاضرین پر پڑتا ہے۔ اور بعض مرتبہ تو ساری مجلس پر ایک بجلی سی کوند جاتی ہے۔ خصوصاً ختم کتاب اور دعا کے موقع پر۔ تو یہ پیمانہ ہزار وسعت و عالی ظرفی کے باوجود چھلک پڑتا ہے۔ اسی طرح وفات نبوی کی احادیث پر دامن ضبط ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ آنکھیں بے اختیار اشکبار اور آواز گلوگیر ہو جاتی۔

عصر کی نماز کے بعد مکان پر عام مجلس ہوتی ہے۔ سارا صحن زائرین اور حاضرین سے بھرا ہوتا ہے۔ ان میں مدرسہ اور طلبا اور بعض اساتذہ بھی ہوتے ہیں۔ اور مدرسہ کے مہمان بھی، چائے کا اس وقت بھی دور چلتا ہے۔ تعویز لکھنے کا اسی وقت معمول ہے۔ مغرب کی نماز کے بعد آپ دیر تک مسجد ہی میں رہتے ہیں۔ اگر کوئی خاص مہمان یا عزیز آئے ہوئے ہوتے ہیں تو ان کو مخصوصی طور پر وقت دیدیتے ہیں۔ عشاء کی نماز سے پہلے دسترخوان پھر بچھ جاتا ہے لیکن شیخ کا عرصہ سے رات کو کھانے کا معمول نہیں، کوئی خاص عزیز مہمان ہوئے تو ان کی خاطر دو چار لقمے تناول فرمالیتے ہیں۔ عشاء ــــ کے بعد پھر کچھ دیر مخصوص و محدود مجلس رہتی ہے جس میں زیادہ تر بے تکلف اور ہر وقت کے حاضر باش خدام یا عزیز مہمان ہوتے ہیں پھر آرام فرماتے ہیں۔

جمعہ کے دن نماز جمعہ سے پہلے مختلف دیہاتوں اور اطراف و مواضعات سے آنے والے

اہل تعلق و ارادت مندوں کو مجلس میں شرکت کی اجازت ہوتی ہے۔ اس موقع پر نئے
طالبین کو بیعت بھی فرماتے ہیں، اور ذکر و اصلاح حال کی تلقین بھی۔ یہ تعداد یوماً فیوماً
بڑھ رہی ہے۔ سارا صحن اور اندر باہر سب بھر جاتا ہے۔ پھر جمعہ کی تیاری ہوتی ہے۔
جمعہ اب حکیم ایوب صاحب کی چھوٹی مسجد میں جو قریب ترین مسجد ہے۔ ادا فرماتے ہیں۔
کھانا معمولاً التزاماً جمعہ کے بعد ہوتا ہے۔ عصر کی مجلس عام جمعہ کے دن ملتوی رہتی ہے۔
شیخ کا برسوں سے جمعہ کے دن مابین عصر و مغرب دعا میں مشغول اور متوجہ الی اللہ رہنے کا
معمول ہے۔ فرماتے ہیں کہ والد صاحب کا بھی یہی معمول تھا۔ چائے بھی اس روز مغرب
کے بعد ہوتی ہے۔

رمضان المبارک میں تو نظام الاوقات بہت بدل جاتا ہے، سرگرمی، جفاکشی
بلند ہمتی، ذوق عبادت، و تلاوت اور یکسوئی و انقطاع اپنے نقطۂ عروج پر ہوتا ہے۔
شیخ کے یہاں رمضان کا معاملہ بالکل الگ ہے۔ اور وہ اولیائے متقدمین اور مشائخ سلف
کی آخری یادگاروں میں سے ہے راقم السطور کو ۱۹۳۶ء میں ایک مرتبہ پورا رمضان
ساتھ گزارنے کی سعادت حاصل ہوئی، نظام الدین میں قیام تھا۔ اور شیخ کی خصوصی
شفقت و تعلق کی وجہ سے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ پورے مہینے کا اعتکاف
تھا۔ روزانہ ایک قرآن شریف ختم کرنے کا التزام تھا۔ قدرے اضافے کے ساتھ (تاکہ
اگر ۲۹ کا چاند ہو جائے تو تیس قرآن مجید ختم کرنے کے معمول میں فرق نہ آئے) نظام الاوقات
یہ رہتا تھا کہ افطار صرف ایک مدنی کھجور سے پھر ایک پیالی چائے اور ایک بیڑہ پان نماز
مغرب کے بعد اوابین شروع فرما دیتے جن میں کئی پارے پڑھتے، اوابین سے فراغت
کے بعد اور عشاء کی نماز سے پیشتر ایک خصوصی مجلس ہوتی جس میں خاص عزیز و خدام شریک
رہتے عشاء اور تراویح کے بعد پھر مجلس ہوتی جس میں ہلکی سی افطاری عموماً امرود یا کیلہ کا
کچالو یا کچھ پھلکیاں بڑے وغیرہ لیکن قلیل مقدار میں کھانے کا اس وقت بھی ذکر نہیں۔

یہ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ مولانا محمد یوسف صاحبؒ بہت ٹھہر ٹھہر کر قرآن مجید پڑھنے کے عادی تھے۔ اس لئے تراویح میں بہت دیر ہو جاتی، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ مجلس میں بیٹھ کر حاضرین مجلس تو آرام کرنے چلے جاتے، شیخ نوافل میں مشغول ہو جاتے، سونے کا ایک منٹ کے لئے بھی معمول نہ تھا۔ اخیر وقت میں سحر کھاتے اور چوبیس ۲۴ گھنٹے میں یہی کھانے کا وقت تھا۔ نماز فجر اول وقت ہو جاتی، نماز کے بعد آرام فرماتے اور دن نکلنے کے بعد بیدار ہوتے، ۲۴ گھنٹے میں یہی سونے کا وقت تھا۔ پھر دن بھر قرآن مجید ہی کا دور رہتا۔ یہی رمضان کا سب سے بڑا معمول تھا۔ جو کچھ وقت ملتا۔ قرآن مجید کی تلاوت اور دور میں گذرتا۔

رمضان کی اس مشغولیت اور علوے ہمت میں صحت کے تنزل کے باوجود اور ترقی ہی ہوتی چلی گئی۔ ان سطور کے تحریر کے وقت تک جو پچھلا رمضان ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء کا گذرا ہے اس کی تفصیل ایک خادم خاص اور ہر وقت کے حاضر باش[1] اس طرح تحریر کرتے ہیں۔

"وسط شعبان سے ۲۰ رمضان تک جو مہمان باہر سے آئے اور پورا رمضان یا کچھ ایام گزار کر واپس آگئے ان کی ایک فہرست ایک خادم نے بطور خود مرتب کی تھی۔ اس فہرست میں ۲۰۳ مہمانوں کے نام ہیں۔

"حضرت شیخ کا نظام الاوقات رمضان شریف میں یہ رہا، سحری کے لیے جب لوگ بیدار ہوتے تو حضرت عموماً نوافل میں مشغول ہوتے۔ اور جب سحری کا وقت ختم ہونے لگتا تو ایک دو انڈے نوش فرماتے اور چائے کی ایک پیالی۔ پھر جماعت تک تکیہ لگائے لوگوں کی طرف متوجہ رہتے۔ مہمان حضرات آمنے سامنے ہوتے۔ بعد نماز فجر آرام فرماتے، تقریباً ۹ بجے دن تک پھر ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل میں مشغول

---

[1] مولانا منور حسین صاحب بہاری مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور

ہو جاتے، دوپہر زوال کے قریب تک پھر ڈاک ملاحظہ فرماتے اور بعض ضروری خط لکھواتے اذان ظہر تک۔ پھر نماز میں مشغول ہوتے بعد ظہر فوراً تلاوت شروع فرماتے۔ مسلسل عصر تک مہمانوں کو ہدایت تھی کہ سب لوگ ہمہ تن ذکر میں مشغول ہو جائیں، قبل عصر تک، چنانچہ ذاکرین ذکر میں مشغول ہوتے اور دوسرے حضرات تلاوت میں مشغول رہتے عصر تک، بعد عصر حضرات قرآن شریف سناتے، اکثر مہمان یا تو قرآن شریف سنتے یا خود تلاوت کرتے، قبیل افطار تک صرف چند منٹ پہلے تلاوت موقوف کر کے مراقب ہو جاتے، مہمانوں کو ہدایت تھی کہ صحن مسجد میں افطاری کے دسترخوان پر چلے جائیں اور حضرت اکیلے پردہ میں ہو جاتے۔ اذان پر دو تین کھجور سے افطار اور اس پر زمزم ایک پیالی نوش فرماتے، پھر مراقب ہو جاتے یا تکیہ لگا کر بیٹھتے۔ نماز مغرب سے فراغت کے بعد مہمانوں کو کھانا کھلایا جاتا۔ اور حضرت دیر تک نوافل میں مشغول رہتے۔ اذان کے آدھ گھنٹے پہلے تک، اس وقت ایک یا دو انڈے نوش فرماتے اور ایک پیالی چائے۔ یہ چائے بھی ہفتہ عشرہ کے بعد بہت اصرار پر شروع ہوئی۔ اس طرح انڈا بھی بحث اصرار پر منظور فرمایا تھا۔ روٹی چاول وغیرہ کی قسم سے کوئی چیز بھی رمضان بھر بلکہ ایک دن پہلے بھی نوش نہیں فرمایا۔

اذان عشاء سے آدھ گھنٹہ پہلے پردہ ہٹایا جاتا، حضرت ٹیک لگا کر مہمانوں کی طرف متوجہ رہتے۔ عجب منظر ہوتا، نئے آنے والے ملتے پھر اذان ہو جانے پر ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل پھر فرض و تراویح میں مشغول ہو جاتے، اس رمضان میں تین قسم کی سماعت فرمائی۔ پہلے مفتی یحیی صاحب نے سنائی۔ پھر حافظ فرقان صاحب نے پھر میاں سلمان سلمہٗ پسر مفتی یحیی صاحب نے "پورا ماہ اعتکاف میں گزرا اور اکثر و بیشتر مہمان بھی معتکف رہے حتی کہ بسا اوقات ڈاک خانہ بھیجنے کے لیے کسی آدمی کا ملنا مشکل ہو گیا تھا۔ بس حضرت کے تین چار خادم کو خاص کر کے ضروریات کے لئے

غیر معتکف دیکھا گیا۔

آخر عشرہ میں یا اس سے کچھ پہلے بعض بعض دوستوں کے بار بار مٹھائی یا کباب لانے کی بنا پر تراویح کے بعد ایک دو لقمہ مٹھائی یا ناشتے کی کباب بھی نوش فرما لیتے، مگر اکثر تو تقسیم ہی کرا دیتے، اوائل رمضان میں اعلان کرا دیا گیا تھا یعنے حضرت نے خود فرما دیا تھا کہ تراویح کے بعد کتاب ہوا کرے گی، چنانچہ کتاب ہی سنانے کا معمول رہا اور اس وقت تک چائے یا کافی وغیرہ کا جو معمول پہلے سے چلا آ رہا تھا اس رمضان میں بند کروا دیا گیا تھا۔ کہ وقت ضائع ہوگا، کتاب وغیرہ سے فراغت کے بعد ـــــ فرماتے حضرات جاؤ وقت کی قدر کرو۔ چنانچہ اکثر تلاوت یا نماز میں لگ جاتے اور حضرت بھی مشغول ہو جاتے، کچھ دیر کے بعد کچھ دیر کے لئے آرام فرماتے مگر تنام عینای ولا ینام قلبی کی طرح کیفیت رہتی کہ ابو الحسن سلمہ سے جو پاس ہی ہوتے کبھی کوئی بات پوچھ بھی دیتے اور یہ فرماتے کہ تم لوگوں کی تلاوت و ذکر سے میرے آرام میں کوئی فرق نہیں آتا۔

اگلے رمضان (۱۳۸۶ھ) کا نظام تقریباً وہی رہا کچھ چیزوں میں تبدیلی تھی، مولوی منور حسین صاحب بہاری نے اپنے مکتوب میں جو حالات لکھے ہیں اس کی چند اہم باتیں یہ ہیں "۲۹ شعبان کو فجر کی نماز سے پہلے ہی مہمانوں اور معتکفوں نے اپنی اپنی جگہوں پر قبضہ کرنا اور بستر پھیلانے شروع کر دیئے چنانچہ بعد فجر جو لوگ گئے تو اکثروں کو تیسری صف میں جگہ ملی۔ حضرت پہلے ہی اعلان فرما چکے تھے کہ ۲۹ شعبان کو بعد عصر مسجد ہی سے اعتکاف گاہ منتقل ہو جائیں گے۔ چنانچہ تشریف لے گئے اور نوے سے اوپر سو سے تین چار کم مہمان بھی مسجد دار الطلبہ جدید میں اقامت و اعتکاف کی نیت سے پہنچ گئے۔ حالانکہ مسجد بہت وسیع اور اندر چھ صفوں کی جگہ ہے مگر مہمانوں اور سامان سے مسجد بھر گئی چنانچہ جو مہمان رات کو یا صبح سے پہلے یا بعد پہنچے ان کو مسجد کے برآمدے میں جگہ دلوائی گئی۔ شام کے دسترخوان میں سو سے کم اور سحری کے وقت سو سے زائد مہمان ہو گئے تھے۔

پھر مہمان آتے گئے اور برآمدہ مسجد کے پُر ہو جانے پر اندرون مسجد جگہ جا بجا دلوائی گئی
اور ہر مہمان کو تقریباً ڈیڑھ فٹ کی جگہ آخیر کے دو عشروں میں میسر رہی۔ مہمانوں کی کثرت
کی وجہ سے دوسرے عشرہ کے وسط میں ایک عظیم الشان خیمہ نصب کرایا گیا یعنی مسجد کے
کھلے صحن میں وہ بھی اخیر عشرہ میں بھر گیا۔ پہلے ہی سے دار الطلبہ جدید کے چھ کمروں کو خالی
کرایا گیا تھا چنانچہ پہلے دوسرے عشروں میں تو صرف معززین کو ان کمروں میں چارپائیوں
پر ٹھہرایا جاتا تھا۔ مگر اخیر عشرہ میں دو کمرے تو معززین کے لئے رہے باقی چار کمروں میں
پرال ڈلوا کر عام مہمانوں کو ٹھہرایا گیا۔ لیکن بعد کو سب ہی کمروں میں پرال پڑے ۲۳ رمضان کے بعد
تک تقریباً پونے تین سو مہمان دسترخوان پر کھاتے رہے: مزید مولوی نصیر الدین صاحب
کے پاس کھاتے رہے۔ اس سال تبلیغی جماعتیں، علماء اور مدرسین اور اہل علم
کثرت سے آئے۔ حضرت نے متعدد اشخاص کو اجازت دی، گجرات۔ بمبئی۔ پالن پور
کے مہمانوں کی تعداد نمایاں تھی۔ یوں یوپی والوں کی تعداد مجموعی طور پر زیادہ تھی۔ افریقہ
انڈمان، میسور، مدراس، بنگال، اڑیسہ، بہار اور آسام کے مہمان بھی تھے۔

ظہر سے عصر تک تلاوت فرماتے رہتے، تمام مہمان ذکر میں مشغول رہتے۔ عصر تک
اکثر ذکر جہری میں بعض ذکر سرّی یا مراقبہ میں اور کچھ تلاوت میں، بات چیت کرنے کی قطعی
اجازت نہ تھی۔ عام ہدایت تھی کہ ہمارے یہاں آؤ تو بات چیت نہ کرو" خواہ سو رہو یا
خاموش بیٹھے رہو۔ کوئی حرج نہیں۔ عصر کے بعد کتابیں سنائی جاتیں، امداد السلوک، علامہ
سیوطی کا ایک رسالہ، نیز ایک اور رسالہ پھر اتمام النعم ترجمہ تبویب الحکم، پھر اکمال
الشیم شرح اتمام النعم اسلوک کی کتابیں پورے رمضان میں سنائی جاتی تھیں۔ افطار
سے پندرہ منٹ پہلے کتاب سنانی موقوف کر دیتے اور پردے میں مراقب ہو جاتے
مدنی کھجور اور زمزم سے افطار فرماتے، کچھ کھانے کا معمول نہیں تھا، پھر مراقب ہو جاتے
نماز مغرب کے بعد تقریباً پون گھنٹے نوافل میں مشغول رہتے۔ پھر دو انڈے کی زردی نوش

فرما کر ایک پیالی چائے پی لیتے۔ پردہ ہٹا دیا جاتا۔ تقریباً سوا سات بجے عام مجلس شروع ہو جاتی (ملنے آنے والوں سے مصافحہ فرماتے اور کب تک قیام کا سوال فرماتے اور محل قیام کے لئے ہدایت فرماتے) پھر آٹھ بجے تک بزرگوں کے واقعات بیان فرماتے اسی درمیان میں بیعت بھی فرماتے۔ اذان ہوتے ہی نماز کی تیاری فرماتے اور خود ضروریا سے فارغ ہوتے اور نوافل شروع فرماتے۔

تراویح سے فراغت پر سورہ یٰسین کا ختم ہوتا۔ اور دیر تک دعا فرماتے رہتے تبلیغی جماعت کے مخصوص حضرات ہوتے ان سے دعا کی فرمائش کرتے پھر کتاب سنانے کا سلسلہ ساڑھے گیارہ بجے رات تک رہتا اور تبلیغی کارروائی سنائی جاتی۔ اس کتابی مجلس کے اختتام پر تقریباً ۱۲ بجے شب کو پردہ گرا دیا جاتا۔ اس سال گھر والوں اور دوستوں کے اصرار و تقاضہ اور اس بنا پر کہ بالکل فاقہ رہنے پر پیاس کا غلبہ ہوتا تھا اور پانی پینے پر معدہ کی رطوبت بہت بڑھ گئی تھی۔ جس کے نتیجے میں رمضان کے بعد بھی کچھ عرصہ تک کچھ کھایا نہیں جاتا تھا۔ افطاری کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ حضرت کچھ تفکر فرما لیتے۔ یون بجے تک مخصوص مجلس جاری رہتی' مراقبہ کی کیفیت رہتی۔ ایک بجے کے بعد سو جاتے چار بجے اٹھتے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر نوافل میں مشغول ہو جاتے۔ صبح صادق سے آدھ گھنٹے پہلے دودھ پاپے کے چند چمچے نوش فرما کر ایک پیالی کچھ نوش فرماتے تھے پھر نوافل میں مشغول ہو جاتے یہاں تک کہ اذان ہو جاتی۔

شیخ کا ان سب علمی و تحقیقی اور دینی و روحانی مشاغل و معمولات کے علاوہ (جن کی موجودگی میں فرصت عنقا معلوم ہوتی ہے) ایک قدیم معمول اہم واقعات اور حوادث وفیات اور بزرگوں' احباب اور مخصوص خدام کی آمد و رفت' دوسری نقل و حرکت کے قلم بند کرنے کا بھی ہے۔ جس کی حیثیت ایک مفصل و مکمل روزنامچہ کی سی ہو گئی ہے۔ اس روزنامچہ میں قمری' شمسی ماہ و ہفتہ اور تاریخ کی قید کے ساتھ گردوپیش

کے اہم واقعات درج ہیں۔ اسی کی مدد سے حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت رائے پوری اور سب سے بڑھ کر مولانا محمد یوسف صاحب کی سوانح مرتب ہو سکی۔ مولانا مدنی کے متعلق بھی اس میں بہت معلومات اور اندراجات ہیں۔ ان بزرگوں کے علاوہ بہت سے خدام اور اہل تعلق کے آنے جانے اور ان سے تعلق رکھنے والے واقعات کی تفصیل ملے گی۔ یہ ایک طرح کا "جام جہاں نما" ہے۔ جس میں ہندوستان، ہندوستان سے باہر کے بھی بہت سے واقعات اور شخصیات کی سوانح و سنین اور تاریخیں ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ شیخ کو اتنی شدید مصروفیت میں اس کے لئے وقت کیسے مل جاتا ہے۔

اخبارات کے مطالعہ کا ہمیشہ معمول رہا۔ بڑے اہتمام سے روزانہ کے اہم اخبارات کو نظر رکھے جاتے اور شیخ ان کو فرصت سے مطالعہ فرماتے، دنیا کے حالات اور جماعتوں کے مزاج و اشغال سے باخبری کا ہمیشہ ذوق رہا۔ لیکن اب جب سے نزول الماء کی شکایت ہوئی ہے اور آنکھیں شیخ کی مدد کے بغیر وہ مطالعہ نہیں کر سکتے اخبارات کے مطالعہ کا معمول تقریباً چھوٹ گیا ہے۔ کبھی کوئی اہم مضمون ہوتا ہے تو اس کو پڑھوا کر سن لیتے ہیں۔ لیکن باخبری اور بیدار مغزی میں اب بھی کوئی فرق نہیں۔

چند اہم خصوصیات و کمالات

کسی ایسی ہستی کی خصوصیات اور کمالات کو لکھنا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اجتبائی معاملہ ہو اور جس کو مدارج عالیہ سے نوازا گیا ہو نہ صرف دشوار بلکہ قریب قریب ناممکن ہے کہ روحانی کمالات، باطنی کیفیات اور عبد و معبود کے معاملات کا صحیح علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔

کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

لیکن جو نمایاں پہلو کوتاہ نظروں اور کم نگاہوں کو بھی نظر آ جاتے ہیں، ان کے ذکر کرنے میں کوئی حرج نہیں، نہایت اختصار کے ساتھ اور عجلت میں یہ چند سطریں قلمبند

کی ہدایت ہی ہیں۔

علوئے استعداد و علوئے ہمت

شیخ کی سب سے زیادہ نمایاں صفت اور اقران و معاصرین میں ان کا امتیاز وہ عالی جوہر، بلند استعداد اور بلند ہمت ہے۔ جو ان کے حصہ میں آئی ہے۔ ان کی اس علوئے استعداد کی شہادت بڑے بڑے اہل نظر نے دی ہے اور اس کے بغیر یہ ترقیات اور کمالات جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرہ مند کیا ہے، ممکن نہیں۔ حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ نے کئی بار حضرت شیخ اور مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ہماری جہاں انتہا ہوتی ہے وہاں سے تم لوگوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ کبھی کبھی فرماتے تھے کہ ان چچا بھتیجے (مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور شیخ الحدیثؒ) کی بات ہی الگ ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ حضرت گنگوہی کی نسبت شیخ الحدیث کی طرف منتقل ہوئی۔ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ شیخ کے ساتھ اپنے ایک خورد اور فرزند کا سا معاملہ جتنا فرماتے تھے اس سے زیادہ ایک بزرگ اور بلند مرتبت شیخ کا سا معاملہ فرماتے، اس کا کچھ اندازہ اس خط سے ہوگا جو خوش قسمتی سے راقم السطور کے پاس محفوظ ہے۔ اور خلاف معمول مولانا ہی کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔

"السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ، اپنے ساتھ آپ کا حسن ظن خوش قسمتی اور عند اللہ بڑی امیدوں کا باعث جانتا ہوں، اللہ تعالیٰ شانہ، خوش رکھے اور اپنے ساتھ صافی و صادق، یکسوئی و طمانیت کے ساتھ نسبتہ محمدیہ مرضیہ روزی فرمائیں۔ اللّٰھم آمین۔

دل خواہاں تھا کہ رمضان المبارک میں تمہارے قرب سے حلاوت اندوز ہوتا مگر تمہیں اپنی دلجمعی جس طرح بھی معمول ہو اُس کی پابندی مناسب ہے تم جیسے عالی ہمت کے لئے اہل و عیال کا ورڈا ہوجانا تو قلب قبول نہیں کرتا۔ انشاء اللہ مناسب وہی ہوگا جس طرف طبیعت مائل ہو، اسباب ظاہری کچھ ہی ہوں۔

رمضان مبارک میں بندہ بھی دعوات کا خواہاں ہے۔ بھولیں نہیں۔
بندہ کے لئے تمہاری ذات انشاء اللہ سرمایۂ دارین ہے تو دعا دل و جان سے نکلنی
ضروری ہے مگر افسوس خدا جانے دل و جان کس خانہ میں ہیں، کچھ پتہ نہیں۔
اللھم ارحم، اللھم ارحم۔ گھر میں سب کو دعوات۔
عزیزی حکیم ایوب کو سلام کے بعد فرمادیں کہ ہمت رکھیں غفلت نہ کریں
آپ اپنا درود مشغلہ مصائب تحریر فرمائیں۔ فقط والسلام۔ بندہ محمد الیاس عفی عنہ،
۱۴ر فروری ۳۹ء

بلند ہمتی و عالی حوصلگی وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد ان کی زندگی کا سارا محور گھومتا ہے۔ ان کے خمیر میں علوئے ہمت اور فراخی حوصلہ کا جوہر ہے علم و تصنیف کا میدان ہو یا عبادت و قرب الٰہی کا یا خدمت و مہمانداری کا یا زہد و توکل کا ہر جگہ ان کی بلند ہمتی کے جوہر عیاں ہیں۔ مال و دولت کو انھوں نے کبھی قابل توجہ اور قابل التفات نہیں سمجھا۔ جس قدر تنخواہوں اور زریں موقعوں کے ٹھکرا دینے کے وہ واقعے گزر چکے ہیں۔ جھنجھانہ کی ایک بڑی آبائی جائداد سے جو تھوڑی سی کوشش سے حاصل ہو سکتی تھی۔ یہ کہہ کر صرف نظر کر لیا۔ اور ہمیشہ کے لئے اس کا خیال بھی دل سے نکال دیا کہ میرے پاس اس کے حصول کی کوشش کے لئے نہ وقت ہے نہ موقع اس عالی ہمتی کا کرشمہ ہے کہ اپنے خاص عزیزوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے بے تکلف قرض لئے ہیں۔ مولانا محمد یوسف صاحب کے اس حج کے موقعہ پر حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کی وفات کے بعد مع اہل و عیال و اعزہ ہونے والا تھا۔ تقریباً ہم ہزار کی رقم قرض لے کر مہیا فرما دی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ کبھی کبھی ۶۰ ہزار تک قرض کی مقدار پہونچ گئی لیکن اللہ تعالیٰ برابر اس بار کو ہلکا کرتا رہتا ہے اور غیب سے سامان پیدا فرماتا رہتا ہے۔
اس علوئے ہمت و ایثار کا ایک حیرت انگیز واقعہ جو اس زمانہ کے لحاظ سے ناقابل

قیاس اور بہت سے لوگوں کے لئے ناقابل یقین ہو گا یہ ہے کہ ایک ایسے بزرگ عالم کے انتقال پر جن کے ساتھ مل کر شیخ نے بہت عرصہ کام کیا تھا اور جس سے کچھ تلمذ کا رشتہ بھی تھا. جب ان کے ترکہ کی تقسیم اور قرض کے تصفیہ کے لئے ان کے ورثا اور اہل تعلق جمع ہوئے تو ورثا نے قرض کی ادائیگی کا ذمہ لینے سے جو غالبًا پانچ ہزار کی مقدار میں تھا صاف معذرت کر دی، شیخ نے بے تکلف اس قرض کو اپنے ذمہ لے لیا اور ادا فرمایا۔

مہمانوں کی کثرت مصارف کی زیادتی آنے جانے والوں کے ہجوم افکار و ترددات روز افزوں ترقی پے در پے جانکاہ حادثات اور جان سے زیادہ عزیزوں اور بزرگوں کی وفات کے داغ پر داغ، خاص طور پر شفیق چچا مولانا محمد الیاس صاحب اور محبوب باعث فخر بھائی و داماد مولانا محمد یوسف صاحب کی اچانک رحلت، وہ صدمے ہیں جن کا برداشت کرے جانا اور اس سب کے باوجود زندگی کے معمولات، طبیعت کی شگفتگی اور مہمانوں کے حقوق کی ادائیگی میں فرق نہ آنے دینا غیر معمولی استعداد اور ہمت خداداد کے بغیر ممکن نہیں۔

شیخ کا زہد و توکل بھی اسی علوئے ہمت کا ایک کرشمہ ہے۔ انھوں نے اسباب دنیا کی فراہمی کی طرف کبھی از خود توجہ نہیں فرمائی، کرایہ کے مکان میں رہنا شروع کیا جس کے متعلق مشہور تھا کہ یہاں کا مکین زندہ نہیں رہتا۔ چنانچہ پے درپے دو تین موتیں ہوئیں پہلے والد صاحب، پھر والدہ، پھر چھوٹے بھائی نے قضا کی۔ لیکن شیخ نے اس مکان سے جنبش نہ کی کبھی اس کو خریدنے کا خیال نہ تھا لیکن اسباب غیب سے ایسے پیدا ہوتے چلے گئے کہ مکان خریدنا پڑا، گھر نیم خام، نیم پختہ تھا، باہر مردانہ میں بیٹھنے کے لئے اور زنان خانہ میں رہنے کے لیے بہت کم گنجائش تھی۔ بہت سے مخلصین نے توسیع کی طرف متوجہ کیا اور مشورہ دیا کہ مکان میں اضافہ اور مرمت کرا دی جائے۔ عمر کی بے ثباتی کا حوالہ دے کر ہمیشہ معذرت کی۔ باہر کے جس کمرے میں قیام تھا اس کی چھت کہنہ اور شکستہ تھی۔

عرصہ تک ایک ستون کے ذریعہ اس کو روکا گیا بالآخران کے منتظم کار مولوی نصیر الدین صاحب نے ان کے رائے پور کے قیام سے ایک مرتبہ فائدہ اٹھایا۔ حضرت رائے پوری کو کہہ دیا کہ مکان میں کام لگا رہا ہوں آپ ایک ہفتہ کے لئے مزید روک لیجئے۔ حضرت نے بھانوں سے روک لیا اور کمرے کو پختہ کرادیا گیا۔ ایک پختہ چھجہ بھی بارش سے حفاظت اور آرائشگی کے لئے بنادیا گیا۔ شیخ واپس آئے تو اس چھجہ کی تعمیر پر بہت ناراض ہوئے اور اسکو فضول اور اسراف قرار دے کر خود توڑ ڈالا اور اس کی جگہ وہی پرانا ٹین کا سائبان لگا دیا گیا۔ جب مہمانوں کی کسی طرح سے گنجائش نہیں رہی تو اس کمرہ کے بالمقابل خدام نے ایک مسقف حصہ بنادیا۔ جس میں عام طور پر دوپہر کا کھانا ہوتا ہے اپنے لباس اور اسباب خانہ داری کے بارے میں اور تمام ذاتی معاملات میں اسی قناعت زہد و توکل، بے اعتنائی اور وارستہ مزاجی سے کام لیتے ہیں اور تلاش کرنے والے کو کہیں کوئی سامان تجمل یا اہتمام نظر نہیں آئے گا۔

صدمات و حادثات کے موقع پر شیخ کا ضبط و تحمل، عالی حوصلگی اور شان تسلیم و رضا، اولیائے متقدمین اور عارفین قدیم کی یاد تازہ کرتی ہے اور اس کی نظیر اس زمانہ میں ملنی مشکل ہے، عام طور پر وہ بڑے سے بڑے صدمے کے موقع پر نہ خود راضی بہ رضا صابر و ضابط اور متبسم و پر سکینت نظر آتے ہیں۔ بلکہ دوسرے غمزدہ اعزا و احباب کے لئے وجہ تسکین، باعث تقویت اور عملی نمونہ ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ اور حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کے ہوشربا اور روح فرسا حادثہ وفات پر ان کی یہی کیفیت دیکھی۔ بعض عزیزو نواسوں اور صاحبزادیوں کے انتقال پر بھی ان کی یہی شان نظر آئی کہ وہ دوسروں کو تسلی دے رہے تھے اور تبسم و خوش مزاجی کے ساتھ مہمانوں کی مہمانداری اور آنے والوں کے استقبال میں مصروف تھے۔ ان للہ ما اخذ و لہ ما اعطی و کل شئ عندہ باجل مسمّٰی، کی وہ مجسم تصویر نظر آتے ہیں۔

جامعیت

اللہ تعالےٰ نے شیخ کے ذات و مزاج کو عجیب و غریب جامعیت عطا فرمائی ہے
جس نے بارہا پنبہ و آتش و شیشہ و آہن کو جمع کر کے دکھایا، طبعی یکسوئی اور فطری خلوت
پسندی کے ساتھ مختلف انوع جہانوں کے حقوق ضیافت کی ادائیگی اور ان کا اکرام و اہتمام
علم و عمل کے تقاضوں کو باہم جمع کرنا نہ صرف مختلف المذاق بلکہ متقابل مسلکوں اور مختلف
تحریکات اور مشاغل کے حاملین سے بیک وقت عقیدت و محبت اعتراف و اقرار جماعت و دفاع کا تعلق
رکھنا اور ان سب کا بیک وقت معتمد علیہ ہونا ایک ایسی خصوصیت ہے ــــ
جس میں بہت کم لوگ شیخ کے شریک و سہیم ہوں گے، کانگرس اور لیگ کے شدید اختلاف
اور تھانہ بھون اور دیوبند کے بُعد کے دور میں بھی وہ دونوں جگہ وقیع محترم اور محبوب رہے
اور ان کی ذات ان تمام تنازعات اور کشاکشوں سے الگ تھلگ رہی، حضرت رائے پوری
اور ان کے خدام کی جماعت احرار اور اس کے سرکردہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا
حبیب الرحمان لدھیانویؒ اسی طرح ان کے گھر کو اپنا گھر اور ان کی ذات کو اپنا خیر خواہ دعا گو
اور مخلص سمجھتے رہے جیسا کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی اور حضرت تھانویؒ کے خلفا
و مریدین مولانا مدنیؒ کے ساتھ ان کو جو خصوصی تعلق و محبت اور اسی کے ساتھ مولانا تھانویؒ
کے ساتھ ان کی جو عقیدت و عظمت اس پورے دور اختلاف میں رہی وہ کسی جاننے والے
سے پوشیدہ نہیں، ان کی تصنیف "الاعتدال فی مراتب الرجال" ان کے اس ذوق اس
جامعیت اور اس توسط و اعتدال کا آئینہ ہے جس سے اللہ تعالےٰ نے ان کو نوازا ہے۔
اور جس نے بارہا ان دینی گروہوں میں جو سب کے سب ایک ہی مرکز و ایک ہی مسلک سے
وابستہ تھے۔ وصل و اتحاد کا بہت کام انجام دیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مختلف مذاق کے
لوگ اور مختلف مشائخ سے تعلق رکھنے والے اپنی علمی و عملی مشکلات کے الجھنوں کے موقعوں
پر شیخ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور ان کو اطمینان بخش اور فیصلہ کن جواب ملتا ہے

سوز و گداز و محبت اور خود انکاری و تواضع

شیخ کے علم، تصنیفی انہماک و وقار و سکینت اور ضبط و تحمل کے فانوس میں عشق و محبت کا ایک ایسا شعلہ ہے جو جاننے والوں کی نگاہوں سے مستور نہیں۔ ان کا خمیر عشق و محبت کے اس جوہر کے ساتھ گوندھا گیا ہے۔ اور وہ شاید ان کے خمیر کے تمام اجزاء و عناصر سے زیادہ مقدار میں ہے ان کا حال وہ ہے جو سودا نے اپنے شعر میں بیان کیا ہے ؎

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا
کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

عشق و محبت کے اس جوہر کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے اور اس کے شرارے اسی وقت نظر آتے ہیں۔ جب عشق الٰہی، ذات رسالت پناہی، اصلاح بارگاہ الٰہی کا تذکرہ ہوا۔ راقم السطور نے اپنے پہلے سفر حجاز کے موقع پر مدینہ طیبہ سے ایک خط لکھا جس میں مدینہ کے راستے کی کیفیات اور بعض نعتیہ اشعار تھے۔ جب یہ خط پہونچا تو شیخ کی عجیب کیفیت تھی جو لوگ پاس موجود تھے ان کا بیان ہے کہ ایک عزیز خادم[1] سے جو خوش الحان بھی تھے ان اشعار کو ترنم کے ساتھ پڑھنے کی فرمائش ہوئی۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ رمضان کے ایام تھے اعتکاف کا موقع تھا۔ اس وقت کچھ لوگ شیخ کا بدن دبا رہے تھے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ جس وقت ان صاحب نے یہ اشعار پڑھے اس وقت شیخ فرط شوق اور شدت جوش میں بالشت بالشت بھر اچھل جاتے، جو لوگ بدن دبا رہے تھے ان کو محسوس ہو رہا تھا کہ شیخ کے جسم میں ایک بجلی سی پیدا ہو گئی ہے اور وہ اپنی کیفیت کو کسی طرح چھپا نہیں سکتے۔ راقم سطور نے خود بارہا دیکھا ہے کہ وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ

[1] مولوی عبد المنان صاحب دہلوی مراد ہیں۔

کے حالات اپنے ایک مسودہ سے حضرت رائے پوری کو سنا رہا تھا۔ شیخ پاس کی چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان پر گریہ کا اتنا غلبہ ہوا کہ چارپائی ہلنے لگی۔ مولانا محمد یوسف صاحب کی معیت میں جو حج ہوا تو اس سے واپسی کے موقع پر اس طرح بلک بلک کر رونے لگے جیسے بچہ اپنی ماں کی گود سے علاحدہ کیا جائے تو وہ بیقرار ہو کر روتا اور بلکتا ہے[۱]

اس سرزمین مقدس اور دیارِ حبیب سے ان کی روح اور قلب کو جو تعلق اور وابستگی ہے اور اس کے چھوٹنے پر ان کے دل پر جو گذر رہی تھی اس کا اندازہ کچھ ان سطور سے ہوگا جو ان کے ایک مخلص خادم نے ان سطور کے راقم کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھی ہیں۔

طائف سے واپسی پر عمرہ کر کے جعرانہ سے احرام باندھا تھا، دوسرے روز جدہ روانگی ہو گئی۔ حدود حرم کے ختم پر جو کنواں ہے وہاں مغرب کا وقت ہوا، نماز کے بعد سوار ہونے کے وقت حضرت پر گریہ طاری ہوا۔ پھر جدہ پہونچ کر محمد علی خان صاحب کے مکان پر رات قیام تھا۔ ساری رات عجیب بے چینی میں گذری۔ حضرت کی خدمت میں صرف محترمی ابوالحسن صاحب اور بندہ موجود تھے۔ باقی خدام اور حضرات حضرت جی کے ساتھ دوسرے کمروں میں تھے۔ حضرت بار بار اٹھ کر بیٹھتے اور ہم لوگ کبھی آہٹ پاکر اٹھ جاتے اور کسی وقت سوئے بنے رہتے، اور دیکھتے رہتے۔ بندہ کو ۲۲ سال سے کئی دفعہ کافی عرصہ کے لئے حضرت کی خدمت میں رہنا ہوا۔ سفر، حضر، عزیزوں، بزرگوں کی اموات، رمضان المبارک کی راتیں، حج کا سفر، عرفات وغیرہ، مختلف اوقات و حالات میں حاضری نصیب ہوئی مگر ایسی حالت پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ کبھی کھڑکی سے منہ نکال کر گلی میں راستوں کو دیکھ رہے تھے اور فرما رہے ہیں، ابوالحسن آج اور عرب کی زمین دیکھ لے

---

۱ روایت مولوی محمد اقبال صاحب ہوشیارپوری

صبح کو جانا ہی ہے۔ دوسرے روز ہوائی اڈے پر انتظار میں ڈیننگ روم بیٹھا
ہوا تو موسم حج اور اپنے ساتھ پاکستان جانے والوں کا کثیر مجمع اور جدہ میں رخصت
کرنے والوں کے ہجوم کی وجہ سے کافی وقت بیٹھنا ہوا۔ بندہ نے حضرت کو روتے
ہوئے پہلے بھی بہت کثرت سے دیکھا تھا۔ اکثر اوقات تو ادیا کر اجنبی کو
تو ظاہر نہ ہوتا تھا کہ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت رو رہے ہیں
اور بعض وقت دیکھنے والوں کو محسوس ہو جاتا تھا کہ نماز، تلاوت وغیرہ میں حضرت
رو رہے ہیں۔ لیکن آنسوؤں کی کثرت کا دستور نہ تھا۔ اور یہ قانون تھا کہ ایسی
حالت میں جب کوئی ملنے والا آگیا یا کوئی دوسرا موضوع سامنے آیا جس میں کسی
سے ہنسی مذاق اور خندہ پیشانی کی ضرورت ہوتی یا کسی کو ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت
ہوتی تو ظاہری طور پر حضرت کی وہ حالت فوراً ختم ہو جاتی اور آنے والے کو کچھ
محسوس نہ ہوتا۔ وقت کے حق کے مطابق حالت ہو جاتی۔ اس رخصتی والے دن
کی حالت بالکل نرالی تھی۔ حضرت تشریف فرما تھے۔ اردگرد کافی مجمع تھا
لیکن ایسے بیٹھے ہوئے تھے جیسے بالکل اکیلے ہوں کوئی بات، کلام توجہ نہ تھی
بے تحاشہ رو رہے تھے۔ آنسو آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے تھے۔ کرتہ تر بتر ہو رہا
تھا، چہرہ مبارک سرخ اور آنکھوں کے پانی سے ایسا دھل رہا تھا جیسا کہ کوئی نل
کے نیچے بیٹھا ہو۔ بس آواز نہیں تھی، حضرت ہاتھ ڈھیلے کئے بیٹھے تھے۔
لوگ چپ چاپ مصافحہ کرتے جاتے تھے، ایک دہشت سی تھی، اسی حالت
میں رخصتی ہوئی۔ چونکہ اس قسم کی حالت ہمیشہ مخفی رکھنے کی عادت تھی اس لئے اگر
خود نہ دیکھا ہوتا تو مجھے بھی یقین نہ آتا۔ بیان کو مبالغہ سمجھتا اور اب اس بیان
کو ناکافی سمجھ رہا ہوں۔"

اسی محبت و اخلاص نے ان کے درس، ان کی تصنیفات اور ان کے ساتھ بیعت

ارادت کے تعلق میں وہ تاثیر اور کیفیت پیدا کر دی ہے جو اہل عشق کے ساتھ مخصوص ہے
ان کمالات کے ساتھ جن سے اللہ تعالےٰ نے ان کو نوازا ہے اور اس محبوبیت و
اختصاص کے باوجود جو ان کو اکابر و شیوخ کے حلقہ میں ہمیشہ سے حاصل رہا ہے۔ وہ اپنے
کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور دعائے نبوی اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا و فی اعین
الناس کبیراً کا ان کی زندگی میں کس قدر ظہور ہوا ہے اس کچھ اندازہ مندرجہ
ذیل اقتباسات سے ہوگا۔ جو ان گرامی ناموں سے ماخوذ ہیں جو اس عاجز کے نام بھیجے
بھیجے گئے تھے پیش کئے جاتے ہیں۔

"بعد سلام مسنون، رائے بریلی والا پرچہ پہونچا۔ روانگی سے قبل ملاقات کو تو
بندہ کا بھی دل چاہتا ہے مگر وقت تنگ رہ گیا۔ یہاں تشریف لانا ایسے
تنگ وقت میں دشوار ہوگا اور مجھے بھی مولوی یوسف صاحب آج کل لاہور
بلا رہے ہیں۔ اس وقت جا کر فوراً دوبارہ جانا مشکل ہے۔ میں نے ان کو
کل لکھا ہے کہ بجائے اس وقت کے اگر اس وقت بلائیں تو زیادہ اچھا ہے
آپ نے یہ نہیں لکھا کہ دہلی سے روانگی کس وقت ہے یا روانگی براہ راست بھار پور
ہے، دہلی سے دریافت بھی کیا ہے۔ مگر وہاں سے جواب کا آنا بھی کالے وارد
بہر حال اگر ملاقات نہ ہو سکے تو اولاً اپنی تمام تقصیرات اور بے عنوانیوں
کی معافی چاہتا ہوں ثانیاً

جاتے ہو تو جاؤ، پر اتنا تو سن جاؤ
یاد جو آ جائیں تو مرنے کی دعا کرنا

بارگاہ رسالت پر پہونچ کر اگر یاد آ جائے تو یہ الفاظ بھی عرض کر دینا ایک روسیاہ

نے کس پر ابر کیا بتاؤں۔

ہندی کتے نے بھی سلام عرض کیا تھا۔ اگر ایک دو طواف بھی اس ناکارہ کی طرف
سے کر دیں تو آپ جیسے کریم جفاکش حضرات سے امید ہے کہ بار نہ ہوگا۔ یہی
چیزیں اس ناکارہ اور نااہل کے لئے اعلیٰ تبرکات ہیں۔ کسی تبرک کے لانے کا
ہرگز ہرگز ارادہ نہ کریں۔ اس سماں نعم البدل میں تعلقات کی قوت کے زور میں
خود ہی تجویز کر دیا کہ مجھے کھجور، زمزم وغیرہ تبرکات کی بہ نسبت دعا اور طواف
کی مسرت ہی زیادہ ہوگی۔ اور احتیاج بھی زیادہ ہے۔

فقط والسلام

زکریا مظاہر العلوم
۲۳ ؍ رجب ۶۶ھ

٭ روضۂ اطہر پر دست بستہ صلوٰۃ و سلام

بعد سلام مسنون! گرامی نامہ مورخہ ۱۳ ؍ رمضان ۲۰ ؍ رمضان مبارک کو
پہونچا، ہر چند کہ ماہ مبارک میں خط لکھنے کا وقت ارادہ سے بھی نہیں ملتا،
لیکن آپ کے انتظار نے مجبور کیا کہ چند سطور تو لکھ ہی دوں۔

گرامی نامہ نے گرمی کے رمضان میں ایک شعلہ سا بدن میں پیدا کر دیا
اس کے سوا کیا عرض کروں، ھنیئاً لارباب النعیم نعیمھم۔ آپ نے راستہ
کی کیفیت اور مناظر تحریر فرما کر سابقہ حالات اور پرانے واقعات یاد دلائے
آپ نے یہ تحریر نہیں فرمایا کہ مدینہ طیبہ کا قیام کب تک ہے؟ تاکہ عید کے بعد کے
عرائض کے متعلق رائے قائم کر سکوں — ماہ مبارک اب قریب الختم ہے اس
میں دوسرا عریضہ بظاہر نہ جا سکے گا اس کے بعد تقریباً ایک عشرہ مسلسل مختلف
اسفار رائے پور وغیرہ میں صرف ہوگا۔

روضۂ اطہر پر دست بستہ صلوٰۃ و سلام کی درخواست جملہ حضرات
کی خدمت میں مکرر عرض ہے

زکریا۔ نظام الدین
۲۲ ؍ رمضان ۶۶ھ

بعد سلام مسنون۔ خیال بلکہ یقین تھا کہ دہلی میں الوداعی زیارت ضرور ہوگی اور اپنی بدحالی کو پیش کرکے کچھ مانگنے کی درخواست کروں گا۔ اپنے دہلی کے اس سفر میں اہم مقصد آپ کی زیارت ہی تھی۔ مگر نظام سفر ایسا گڑبڑ ہوا کہ مجھے خود ہی مولانا مولوی محمد منظور صاحب نعمانی کی معرفت یہ کہلانا پڑا کہ آپ سیدھے ہی تشریف لے جائیں مگر یہ ضرور ہے کہ نہ ملنے کا قلق ضرور رہا۔ اور رہے گا۔ اب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان حروف کے ذریعہ اپنی بدحالی کو پیش کروں آپ خود ہی اندازہ کرلیں گے کہ اس سے زیادہ محروم القسمت کون ہوگا جس کو حضرت اقدس اور آپ جیسا بہترین رفیق سفر ملے اور کرایہ کا اس کو اشکال نہ ہو، بظاہر کوئی مانع نہ ہو پھر بھی وہ محروم رہے تو اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اس کی روسیاہی اس قابل نہیں کہ اس پاک دیار میں حاضری کی اجازت دی جاسکے۔ اب آپ سے انتہائی لجاجت سے درخواست ہے کہ ملتزم پر اور مواجہ پر آپ اس ناپاک کے لئے جو کچھ کرسکتے ہوں کردیجیے، اللہ جل شانہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے اور یہاں کے مسلمانوں کے لئے کیا کہنا ہے۔ یہ تو آپ کا دل مجھ سے بھی زیادہ جانتا ہوگا۔

فقط والسلام　　زکریا

مظاہر علوم ۲۱ر ذی قعدہ ۶۹ھ

اس تعلق باطنی کیفیت اور عشق روحانی کا کچھ اندازہ کرنے کے لیے یہاں ان کے چند مکتوبات کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ جو انھوں نے ازراہ شفقت و کرم راقم سطور کو حجاز کے دوران قیام میں (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۰ء) دو حج کے موقع پر تحریر فرمائے ہیں۔

ہمارا نام لے کر آہ بھی ایک کھینچ لو قاصد
جو وہ پوچھیں تو کہہ دینا یہ پیغام زبانی ہے

بعد سلام مسنون۔ کراچی سے دو گرامی نامے پہونچے اول مفصل لفافہ اور پھر

مختصر کاربرد مگر وہاں جواب کا وقت نہ تھا آپ نے اس ناپاک کی بیعت قبول نہ فرمائی
گی آرزو لکھی مگر یہ نجس العین اس پاک خطہ کے قابل کہاں، دو مرتبہ حاضری ہوئی
مگر ایک طاہر و مطہر ہستی تھی جس کے پیچھے نظیر بھی لگ لیا بلکہ چکنی لگا لیا گیا۔ اب
کوئی پاک ہستی ایسا سمندر نظر نہیں آتا جس میں ہر قسم کی غلاظت مغلوب ہو جائے
فیاحسرتا آپ نہ معلوم کس مغالطہ میں ہیں۔ اپنی یہ حالت ہے۔

کان ظنّی بأن الشیب یرشدنی ۔۔۔ اذا اتی فاذا غیّ بہ کثرا
کنت امرأ من جند ابلیس فارتقی ۔۔۔ بی الدھر حتی صار ابلیس من جندی
فلو مات قبلی کنت احسن بعدہ ۔۔۔ طرائق فسق لیس یحسنہا بعدی

اس تعلق اور محبت کے واسطے سے جو آپ کو اللہ رب العزت کی سرکار کی وجہ
سے اس ناپاک سے محض مغالطہ کی وجہ سے رہا ہے۔ درخواست ہے کہ مبارک مہینہ
میں مبارک راتوں میں مبارک جگہ میں اگر دعائے دستگیری فرما دیں تو وہ پاک
ذات وہ مقلب القلوب، قادر مطلق جو مسلیح کو عمر بنا دے اس کے لئے کیا مشکل ہے
کہ ایک ناپاک کو پاک بنا دے اور بدکار کو نیک کار بنا دے ؎

چشمہ فیض سے گر ایک اشارہ ہو جائے ۔۔۔ لطف ہو آپ کا اور کام ہمارا ہو جائے

عمر ختم ہوتی جا رہی ہے، ظاہری طور پر وقت قریب ہی آتا جا رہا ہے اور حالت
یہ ہے ؎

آئی تھی کچھ بن کر اور بھول چلی کچھ اور ۔۔۔ کیا دکھاؤں گی اپنے پیا کو میرے خالی دونوں ہاتھ
دیتے ہیں موئے سفید افسوس پیغام اجل ۔۔۔ نفس سنتا ہی نہیں ہر چند کہتا ہوں سنبھل

اپنی حالت کو کہاں تک روؤں اور اس منافقانہ تحریر سے آپ کے مبارک اوقات
کو کہاں تک ضائع کروں یہ سطریں اس امید پر لکھی ہیں کہ آپ کے دل پر کچھ چوٹ
لگے تو آپ اس پاک دربار میں کچھ عرض کر سکیں جس کی پاک جوتیوں کے ذرے

لو اقسم علی اللہ لابرّہ" کے مصداق ہیں۔ بصد ادب صلوٰۃ وسلام کے بعد عرض کردیں کہ اس ناپاک کا سلام اس پاک دربار کے ہرگز لائق نہیں، لیکن تم رحمۃ العالمین ہو اس ناپاک کے لئے تمہاری نظر رافت کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے ؎

نہ آخر رحمۃ للعالمینی   ز محروماں، چرا غافل نشینی

یہ بھی عرض کردیں کہ کچھ عرض کرنے کا منہ نہیں اس لئے کیا عرض کروں ......

فقط والسلام زکریا مظاہر علوم

۲۴ / شعبان ۶۶ھ

" ایک خصوصی درخواست آپ سے یہ بھی ہے کہ ملتزم پر ایک مرتبہ کبھی اس ناپاک کے لئے مانگ دیجئے۔

من نگویم طاعتم بپذیر   قلم عفو بر گناہم کش

کیا بعید ہے کہ گناہوں سے پاک صاف لوگوں کی زبان کسی ناپاک کی معافی کا ذریعہ بن جائے۔ اس میں کوئی تصنع نہیں کہ اپنی بڑی گندگیوں کے باوجود جس چیز پر بڑا فخر اور اس کی بڑی ڈھارس ہے وہ صرف یہ ہے کہ بچپن سے اس وقت پیری تک اللہ کا بہت کرم رہا کہ ہر دور کے اکابر اہل اللہ کی خصوصی شفقتیں، انتہا سے زیادہ رہیں۔ اس پر جتنا بھی ناز ہو کم ہے۔ لیکن ساری خوشی ایک دم سناٹے سے بدل جاتی ہے۔ جب قیامت کے حکم "وامتازوا الیوم ایھا المجرمون" کا اعلان دل میں گزر جاتا ہے۔ کاش آپ سب مخلصوں، حسن ظن رکھنے والوں کے زور اس سال اس ناپاک کے اعمالنامہ سیاہ کو بھی دھو ڈالیں تو آپ سب کا کس قدر احسان اس ناپاک پر ہو۔ ورنہ جب کل کو میری ناپاک حالت آپ کے سامنے ہوگی تو آپ کے اپنے اس تعلق پہ بھی افسوس ہوگا۔ جو آپ نے اپنے اس مفصل گرامی نامہ میں تحریر فرمایا، جو بمبئی سے لکھا۔ فقط والسلام

زکریا۔ مظاہر علوم   ۲۶ / ذیقعدہ ۶۹ھ

تصنیفات و تالیفات

شیخ کی تصنیفات و تالیفات بالکل دو مختلف قسم و طرز کی ہیں۔ خالص علمی و تحقیقی، خالص
دعوتی و اصلاحی، عام طور پر جو لوگ پہلے طرز کے عادی ہوتے ہیں، وہ دوسرے طرز میں کامیاب
نہیں ہوتے اور جو دوسرے طرز کے عادی ہو جاتے ہیں وہ پہلے طرز میں اس کے آداب و معیار
کو قائم نہیں رکھ سکتے لیکن شیخ کے دونوں طرز کی تصنیفات موثر اور کامیاب ہیں۔ پہلے طرز کا نمونہ
"اوجز المسالک" (۱۶ اجزا) اور لامع الدراری ہے، دوسرے طرز کا نمونہ حکایات صحابہؓ اور فضائل
کی مقبول عام کتابیں، فضائل نماز، فضائل رمضان، فضائل ذکر، فضائل قرآن، فضائل حج، فضائل
صدقات، فضائل تبلیغ اور فضائل درود ہے۔ اور ان دونوں طرزوں کی جامع شمائل ترمذی کا
ترجمہ و شرح خصائل نبویؐ ہے، پہلے طرز کی کتابیں خواص اہل علم میں مقبول ہیں، میں نے علامہ
حجاز مفتی مالکیہ سید علوی مالکی سے جو نہایت متبحر وسیع النظر عالم ہیں۔ "اوجز" کی تعریف سنی، وہ
اس پر تعجب کا اظہار کرتے تھے کہ خود مالکیہ کے اقوال و مسائل کا اتنا گہرا علم اور اتنی صحیح نقل موجب
حیرت ہے "لامع الدراری" حدیث کے طالب علموں اور مدرسین کے لیے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ
ہے۔ اور اس سے بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی قدر اہل درس ہی کر سکتے ہیں۔ لامع الدراری
کے شروع میں بڑی تقطیع (۱۷x۲۷) پر ایک سو باون ۱۵۲ صفحے کا فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں نہ صرف
امام بخاری اور ان کی نادرۂ روزگار جامع صحیح کے مختلف گوشوں، مباحث و مسائل پر مبسوط کلام
ہے اور اس میں وہ معلومات، فوائد و نکات جمع کر دیئے گئے ہیں جو اصول و رجال اور تذکروں کے
ہزاروں صفحات میں منتشر ہیں بلکہ مراتب کتب حدیث، ابواب حدیث، تقلید و اجتہاد اور احناف
کے دفاع کے سلسلے کی وہ تحقیقات بھی جمع کر دی گئی ہیں۔ جن سے یہ مقدمہ طالبین علم حدیث
بالخصوص حنفی المسلک علماء کے لئے ایک اچھی بیاض (علمی کشکول) بن گیا ہے۔ اس میں کچھ شیخ
کی ذاتی تحقیقات ان کی طویل درس حدیث اور وسیع مطالعہ کا نچوڑ بھی ہے۔ لامع کی پہلی جلد بڑی
تقطیع پر سو مقدمہ کے پانچسو بارہ ۵۱۲ صفحات پر تمام ہوئی ہے۔ متن میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی

کے افادات بھی ہیں جو احادیث کی شرح یا ابواب و تراجم کی توجیہ اور امام بخاری کے مقاصد کی تشریح اور فقہ و حدیث کی تطبیق میں اپنے حلقۂ درس میں ارشاد فرمائے اور مولانا یحییٰ صاحبؒ نے ان کو قلم بند کر لیا اس متن پر شیخ الحدیث کے حواشی ہیں جہاں کہیں متن میں کوئی غموض یا ابہام یا تفصیل طلب اجمال رہ گیا یا جہاں کہیں ان کو اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی اور اپنے درس میں انھوں نے علمی طور پر دا اشکال محسوس کیا اور اس کے حل یا توجیہ کی ضرورت ہوئی اس کا اضافہ کر دیا۔ اس طرح یہ کتاب اساتذۂ علم حدیث کے لئے بڑی مفید اور معاون اور رہبر بن گئی ہے "لامع" کی دوسری جلد بھی اسی سائز پر اتنے صفحات پر تمام ہوئی ہے اور کتاب الجہاد" تک پہونچ گئی ہے۔

اسی طرح سے "اوجز" کے شروع میں نوے صفحے کا ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں فن حدیث کے تعارف و تاریخ اور تدوین حدیث پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ پھر کتاب اور صاحب کتاب امام مالکؒ کا مفصل تعارف اور ان دونوں کے خصوصیات و امتیازات کا مفصل تذکرہ ہے نیز اس کی شروح اور عہد بہ عہد خدمات اور اس کے ساتھ امت کے اعتناء کا ذکر ہے پھر اپنے مشائخ اور سلسلۂ ولی اللہی کے اسانید کی تفصیل پھر اس کے بعد امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ اور ان کے محدثانہ حیثیت و درجہ اور ان کے اصول و مسلک کا تذکرہ ہے۔ پھر متفرق فوائد و قواعد اور ہدایات و توجیہات ہیں۔

فضائل کے رسائل ہمارے زمانہ کی مقبول ترین اردو مطبوعات میں ہیں، شیخ کے اخلاص اور تبلیغی جماعت کے اپنا لینے کی وجہ سے ان کی اتنی اشاعت ہوئی اور وہ اس کثرت سے پڑھے اور سنائے گئے کہ شاید دینی حلقہ کی کوئی کتاب نہ اتنی بار چھپی اور نہ اتنی بار پڑھی گئی۔ حکایات صحابہؓ اور فضائل کے بعض رسالوں کا ترجمہ ہندستان کی متعدد علاقائی زبانوں کے علاوہ انگریزی اور جاپانی میں بھی ہو گیا ہے اور یہ اشاعت و مقبولیت بفضلہٖ تعالیٰ روز افزوں ہے۔ أطال اللہ حیاتہ ونفع المسلمین بہ۔

منقبت شیخؒ

از

مولانا محمد ثانی حسنی

ترا مے خانہ ہے مے خانۂ عرفان اے ساقی — یہاں پیتے ہیں میکش بادۂ عرفان اے ساقی

پلا مجھ کو بھی جام بادۂ عرفان اے ساقی — ترا مجھ پر بہت ہوگا بہت احساں اے ساقی

تجھے ہے خاص نسبت حضرت ساقیٔ کوثر سے — انہی کے میکدے سے ہے ترا فیضان اے ساقی

تو ساقی ہو وہی ساقی ہے جس کے فیض کا چرچا — ترے اک جام پر ہوں میکدے قربان اے ساقی

شراب معرفت پیتے ہیں ہر دم سیکڑوں میکش — ترے میخانۂ عرفان سے ہر آن اے ساقی

ترے ہاتھوں سے مل جائے جو جام معرفت مجھ کو — تو آ جائے مجھ ایسے نیم جاں میں جان اے ساقی

بہارِ جاں فزا ہے فصل گل ہے دین و ایماں کی — حسیں شام و سحر ہیں اور ہے رمضاں اے ساقی

چلے ہر لمحہ دور بادۂ گلگونِ عرفانی — بڑھے ہر لحظہ ترے میکدہ کی شان اے ساقی

"الا یا ایہا الساقی ادر کأسا و ناولہا" — شراب معرفت پینے کا ہے ارمان اے ساقی

بدہ ساقی مے نابم کہ یکدم بے خبر گردم — تری نظر عنایت پر میں ہوں قربان اے ساقی

مئے ناب یقیں و علم و عرفاں چاہیے مجھ کو — ملے جس سے مجھے اللہ کی پہچان اے ساقی

رہے باقی یہ بزم مے رہیں جام و سبو باقی
بڑھے بڑھتا رہے ہر دم ترا فیضان اے ساقی

ای کہ تو شیخ الحدیث آقای من عالی مقام

در نگاہم تو امام ملت خیر الانام

سرگروہ اولیاء سرخیل مردان خدا

سربراہ اہل دیں منجملہ خاصان کرام

ناز اصحاب حدیث و فقہ و تفسیر و ادب

تذکرۂ اہل عزیمت فخر اسلاف عظام

ای کہ تو شمع شبستان عمل در راہ حق

ای کہ تو مرد بزرگ و بندۂ رب الانام

ای کہ تو در دور حاضر نقطۂ پرکار حق

ہادی روشن ضمیر و پاک دل شیریں کلام

صاحب قلب و نظر علم و عمل مہر و وفا

تو مرا آقا و مرشد من ترا ادنیٰ غلام

من حقیرے بے نوائے خاکپائے آنجناب

غرق ایں دم من شوم در بادۂ عشقت تمام

حال من ابتر شدہ آقائے من تدبیر کن

آہ من ہستم اسیر دام نفس بے لگام

تا دم آخر ترا منت شناسم ہر نفس

گر توجہ می کنی بر حال من از لطف عام

در جناب حق تعالیٰ من دعائے می کنم

رحمت او سایہ گستر بر سر والا مدام

میں شیخ میرے محبوب دلبر — مردِ مجاہد مردِ قلندر
علم و عمل کے ہیں شیخ پیکر — جانِ عزیز اور دل سے موقر
ان کی نوائیں ان کی ادائیں — ہیں خوش سے خوشتر بہتر سے بہتر
دل ہر کشادہ شیریں زباں ہے — روشن جبیں ہے چہرہ منور
ہر بول ان کا جادو اثر ہے — ہے ان کی مجلس کیا روح پرور
محبت میں ان کی تاثیر وہ ہے — بگڑا ہوا دل بنتا ہے اکثر
قدموں میں ان کے ہے کج کلاہی — ٹھوکر پہ ان کے تاجِ سکندر
ان کے قدم سے صحرا ہے گلشن — ان کی نظر سے کانٹے گُلِ تر
آتا ہے کوئی گر زاغ بن کر — جاتا ہے بن کر شہبازِ شہپر
ان کے مصاحب ان کے فدائی — کچھ ہیں کواکب کچھ ماہ و اختر
ان کے ہیں پیرو عاشق خدا کے — ان کی جماعت ہے حق کا لشکر
ہے شغل ان کا شب زندہ داری — ہے ذکر ہر دم جاری لبوں پر
کرتے ہیں جس پر نظر کرم وہ — خوش بخت بنتا ہے لعل و گوہر
اللہ رکھے ان کو سلامت — تعلیم ان کی ہو عام گھر گھر
ثانی ہے ان کا ناچیز خادم — گرچہ ہے کمتر اور بد سے بدتر
ہے فرق ان میں ارض و سما کا — ہے ایک قطرہ میں اک سمندر

ہیں شیخ رکھتے کیا شان عالی
اللہ اکبر، اللہ اکبر

ہیں شیخ حقیقت میں اک مرشد ربانی — نازاں ہے عمل جن پر وہ عالم حقانی

اعمال ہیں پاکیزہ اخلاق ہیں روحانی — کیا خوب ہے چہرہ پر انوار کی تابانی

ہے مجلس پاک ان کی کیا مجلس نورانی — رحمت کی ہے ارزانی برکت کی فراوانی

وہ صحبت با برکت پر کیف و یقیں پرور — کرتی ہے عطا دل کو کیفیت احسانی!

کرتی ہے اثر ایسا پاکیزہ نظر ان کو — ذرہ کو بناتی ہے وہ لعل بدخشانی!

کیا زہد و قناعت ہے کیا جود و سخاوت ہے — شاہی میں فقیری ہے اور فقری میں سلطانی

جو علم نبوت ہے سینے میں نہاں ان کے — اس علم پہ صدقے ہوں شیرازی و خاقانی

لغزش نہ کوئی آئی قدموں میں کبھی ان کے — طوفاں اٹھے اکثر بولہبی و ہامانی

اس راہ مبارک کے رہبر بھی ہیں آہی بھی — جس راہ کے رہرو تھے شیبانی و شوکانی

میخانۂ عرفاں کے ہیں ساقی مستانہ — جو کردیں عطا وہ مے جو پھینک دیں وہ پانی

ہے میری نگاہوں میں دنیائے تصوف کے — وہ شبلی و جیلانی، ملتانی و سمنانی

الحاد کی ظلمت میں وہ نور محمد[1] ہیں — ہیں نور محمد سے ظلمت کدے نورانی

وہ اپنے زمانہ کے امداد[2] ہیں اشرف[3] ہیں — سرسبز و نہال ان سے ہے گلشن عرفانی

گلہائے رشیدی[4] ہیں یہ نکہت و رنگ ان سے — وہ روح گلستانی وہ باد دبستانی

بستان خلیلؔ[5] ان ہیں — ان سے ہی پھلا پھولا ہر گوشۂ بستانی

جذبہ ہے انھیں حاصل محمود[6] کا قاسم[7] کا — ہو جذبۂ آزادی یا جذبۂ ایمانی

---

[1] حضرت شیخ نور محمد جھنجھانوی [2] شیخ امداد اللہ مہاجر مکی۔ [3] حضرت مولانا اشرف علی تھانوی [4] حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ [5] حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری [6] شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ۔ [7] حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند۔

وہ صبر و عزیمت میں ہیں مثلِ حسین احمدؒ[1] — ہے سر پہ وجاہت کا ایک تاج سلیمانی
وہ مردِ مجاہد ہیں وہ مردِ قلندر ہیں — ہر ضرب کلیمی ہے ہر نکتہ ہے لقمانی
اللہ نے بخشی ہے خوئے اسد اللہی — کردار ہے عثمانی اخلاق ہیں سلمانی
ہو حلقۂ درس انکا یا مجلس خاص ان کی — کھلتا ہے چمن جب وہ کرتے ہیں گلفشانی
وہ خلق مجسم ہیں وہ علم سراپا ہیں — وہ مہر درخشاں ہیں وہ شمع شبستانی

تا دیر رہے سایہ اس مرشد کامل کا
اللہ سے کرتا ہے ہر لحظہ دعا ثانی

O

مرے نزدیک حضرت شیخ ہی ہیں مرشد کامل
مجھے ان کی توجہ سے ہوا عرفان حق حاصل
رہا جو ان کی خدمت میں بنا وہ عالم و فاضل
انھیں کی تربیت سے بن گئے لاکھوں خدا واصل
نہ جانے کشتیاں کتنی، دلوں کی نذر طوفاں تھیں!
بچایا ڈوبنے سے ان کو پہونچایا لب ساحل
جو ان کے علم و تقویٰ کی حقیقت کو نہ پہچانے
وہ ناداں سے ہے ناداں اور وہ جاہل سے ہے جاہل

---

[1] حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی

شیخ فخرِ دین و ملت نازشِ ملک و وطن ‏— شیخ سے ہے دورِ حاضر میں ہدایت کا چلن

شیخ سے روشن چراغِ سنتِ ختم الرسلؐ ‏— شیخ وارثِ انبیاء کے نائبِ شاہِ زمنؐ

شیخ سے حاصل ہوئی مردہ دلوں کو زندگی ‏— شیخ کے منت کشاں اہلِ نظر اہلِ سخن

شیخ سے آباد ویرانے ہوئے دل کے تمام ‏— شیخ کے اعلانِ حق سے گونج اٹھے کوہ و دمن

شیخ مردانِ خدا کے قافلہ سالار ہیں ‏— شیخ دل کی انجمن کے ہیں امیرِ انجمن

شیخ نے شمعیں جلائیں علمِ دیں کی ہر طرف ‏— شیخ نے جاری کئے عرفان کے گنگ و جمن

شیخ کو کہنا بجا ہے حضرت شیخ الحدیث ‏— شیخ سے علمِ حدیثِ پاک کا مہکا چمن

شیخ ہیں نورانی صورت شیخ ہیں پاکیزہ دل ‏— شیخ ہیں روشن جبیں شیریں زباں غنچہ دہن

شیخ کی صحبت یقیناً صحبتِ اکسیر ہے ‏— شیخ کی ہر ہر نظر خورشید کی نوری کرن

شیخ ہیں شیخ المشائخ قطبِ ملت قطبِ دیں ‏— شیخ ہیں اس دور کے صدیق و فاروق و حسن

شیخ کا ہے خوشہ چیں ندوہ مظاہر دیوبند ‏— شیخ کا قائل حجاز سیریا مصر و یمن!

شیخ میر صاحبانِ عشق و مستی درد و سوز ‏— شیخ نشانِ کلیر و اجمیر و دہلی اجودھن

شیخ سے حاصل ہوئی سوغات ذکر اللہ کی ‏— شیخ کے دم سے ہوا ہر خالِ دل گل پیرہن

شیخ کی ہر جنبشِ لب دین کی جھنکار ہے
شیخ کی ہر ہر ادا حق کوش ہے باطل شکن

صاحب علم و فضیلت حضرت شیخ الحدیث
نازش دین و شریعت حضرت شیخ الحدیث

سرگروہ اہل دل، اہل صفا، اہل وفا
سرور اہل عزیمت حضرت شیخ الحدیث

باعث فخر جہاں معرفت جن کا وجود
مرجع اہل مشیخت حضرت شیخ الحدیث

سب کو دیتے ہیں متاع عشق و مستی درد و سوز
بانٹتے ہیں دل کی دولت حضرت شیخ الحدیث

مرجع اصحاب درس فقہ و تفسیر و حدیث
قاسم علم نبوت حضرت شیخ الحدیث

گلشن عرفان کی باد نسیم مشکبار
نکہت باغ طریقت حضرت شیخ الحدیث

نقطۂ پرکار حق ان کی مبارک ذات ہے
مرکز اہل خشیت حضرت شیخ الحدیث

خندۂ لب روشن جبیں شیریں سخن شیریں قلم
پاک رو پاکیزہ طینت حضرت شیخ الحدیث

ظلمتوں میں جہل کی کرتے ہیں روشن ہر نفس
مشعل علم و فضیلت حضرت شیخ الحدیث

شرق سے تا غرب جن کا سلسلہ مقبول ہے
ہیں وہی شیخ طریقت حضرت شیخ الحدیث

حضرت مفتی الٰہی بخش کے نعم الخلف
دین حق کی شان و شوکت حضرت شیخ الحدیث

ہے گلستان رشیدی جن سے سرسبز و نہال
ہیں وہی باران رحمت حضرت شیخ الحدیث

علم و عرفان خلیلی کے گلستاں کی بہار
گلشن یحییٰ کی نکہت حضرت شیخ الحدیث

ہیں سراپا حسن دیں حسن یقیں حسن عمل
صاحب نور بصیرت حضرت شیخ الحدیث

صاحب عشق و محبت کیف و مستی درد و سوز
پاک صورت نیک سیرت حضرت شیخ الحدیث

ہیں نگاہ اہل دل مردان حق آگاہ میں
قابل صد فخر و عزت حضرت شیخ الحدیث

حضرت شیخ سے ہے عقیدت مجھے
ہے محبت سے بڑھ کر محبت مجھے

ان کی ہر ہر ادا سے ہے الفت مجھے
جان سے ہے عزیز ان کی عزت مجھے

وہ دلوں کا سکون اور آنکھوں کا نور
ان سے حاصل ہے دل کی سکینت مجھے

میرے استاذ بھی ہیں مرے شیخ بھی
حاصل ان کی ہے شفقت پہ شفقت مجھے

حضرت شیخ ہی کی بدولت ملی
علم و عرفاں کی انمول نعمت مجھے

ان کی صحبت میں کچھ رہا تو پڑی
اللہ اللہ کہنے کی عادت مجھے

جب بھی ڈالی محبت کی مجھ پر نظر
مل گئی دین و دنیا کی دولت مجھے

بخشی مجھ کو انھوں نے متاع یقیں
کی عطا مشعل راہ سنت مجھے

جس سے پیدا ہوا میرے دل میں حضور
ان سے حاصل ہوئی ایسی نسبت مجھے

آہ ناآشنائے حقیقت تھا میں
کر دیا آشنائے حقیقت مجھے

مرشد کامل ان کو سمجھتا ہوں میں
حد سے بڑھ کر ہے ان سے عقیدت مجھے

ان کی عظمت مرے دل میں کیوں کر نہ ہو
ان سے حاصل ہوئی خیر و برکت مجھے

ہے حقیقت میں لذت میں لذت وہی
ذکر کی جو ملی ان سے لذت مجھے

ان کے احسان کو بھول سکتا نہیں
دے کے عرفان حق بخشی عزت مجھے

ان کے دشمن کو دشمن سمجھتا ہوں میں
جو انھیں چاہے اس سے ہے چاہت مجھے

○

وہ شیخ کہ جن کے قدموں سے آباد دلوں کے ویرانے
وہ شیخ کہ جن کی برکت سے ہیں بادۂ حق کے مے خانے
وہ شیخ کہ ہیں جو ساقی مہ گردش میں ہیں جن سے پیمانے
وہ شیخ کہ جن کے بن کر ہم بھولے ہیں جہاں کے افسانے
ہیں شیخ ہمارے شمع ہدیٰ، ہم شمع ہدیٰ کے پروانے
ہم ان کی اداؤں پر ہیں فدا، ہر ایک ادا پر دیوانے

وہ شیخ کہ جن کو کہتے ہیں ہم مرشد برحق ربانی
وہ شیخ کہ جن کو بخشا ہے اللہ نے قلب سمنانی
وہ شیخ کہ جن کو حاصل ہے پاکیزہ نگاہ جیلانی
وہ شیخ کہ جن کی مجلس ہے پرکیف و مبارک نورانی
ہیں شیخ ہمارے شمع ہدیٰ، ہم شمع ہدیٰ کے پروانے
ہم ان کی اداؤں پر ہیں فدا، ہر ایک ادا پر دیوانے

ہیں شیخ ہمارے پاک نظر ہیں خندہ جبیں ہیں شیریں سخن
ہیں شیخ ہمارے مہر مبیں پر نور ہے جن سے صبح وطن
وہ شیخ کہ جن سے مہکا ہے سنت کے پھولوں کا چمن!
وہ شیخ کہ جن کی جنبش لب ہے لعل بدخشاں در یمن!
ہیں شیخ ہمارے شمع ہدیٰ، ہم شمع ہدیٰ کے پروانے
ہم ان کی اداؤں پر ہیں فدا، ہر ایک ادا پر دیوانے

اللہ کے بندوں کو ان سے ایمان کی دولت ملتی ہے
ہو دولت دنیا جس پر فدا وہ دین کی نعمت ملتی ہے
جس دل پہ نظر فرماتے ہیں اس دل کو سکینت ملتی ہے
دل عشق کا سودا پاتا ہے سوغات محبت ملتی ہے

ہیں شیخ ہمارے شمع ہدیٰ، ہم شمع ہدیٰ کے پروانے
ہم ان کی اداؤں پر ہیں فدا، ہر ایک ادا پر دیوانے

وہ شیخ کہ جن کی صحبت سے ہر ذہن مجلّا بنتا ہے
وہ شیخ کہ جن کی خدمت سے ہر قلب مصفّا بنتا ہے
جو خاک کا ذرہ ہوتا ہے وہ لؤلؤ و لالا بنتا ہے
غافل جو خدا سے ہوتا ہے عاشق وہ خدا کا بنتا ہے

ہیں شیخ ہمارے شمع ہدیٰ، ہم شمع ہدیٰ کے پروانے
ہم ان کی اداؤں پر ہیں فدا، ہر ایک ادا پر دیوانے

شاداب ہیں جس کے غنچہ و گل وہ شیخ کا گلشن گلشن ہے
ہے شیخ کی مجلس، مجلس دل وہ اہل یقیں کا مخزن ہے
آغوش محبت شیخ کی ہی نایاب گہر کا معدن ہے
جس شمع پہ نازاں شمعیں ہیں وہ شیخ کی شمع روشن ہے

ہیں شیخ ہمارے شمع ہدیٰ، ہم شمع ہدیٰ کے پروانے
ہم ان کی اداؤں پر ہیں فدا، ہر ایک ادا پر دیوانے

وہ بزم ہے بزم احسانی جس بزم کے ہیں وہ صدر نشیں
اس بزم کی ہے ہر صبح حسیں، اس بزم کی ہے ہر شام حسیں

اس بزم میں آکر پاتا ہے ہر ایک متاع علم و یقین
اس بزم پہ صدقے حشمت و زر، اس بزم پہ صدقے تاج و نگیں
ہیں شیخ ہمارے شمع ہدیٰ ہم شمع ہدیٰ کے پروانے
ہم ان کی اداؤں پر ہیں فدا، ہر ایک ادا کے دیوانے

یہ بزم ہے جس میں شام و سحر رحمت کے فرشتے آتے ہیں
وہ بن کے گھٹائیں رحمت کی اس بزم پہ آکر چھاتے ہیں
وہ ذکر مسلسل سن سن کر رحمت کا مینہ برساتے ہیں
ویران دلوں کے صحرا میں پھولوں کا چمن مہکاتے ہیں
ہیں شیخ ہمارے شمع ہدیٰ ہم شمع ہدیٰ کے پروانے
ہم ان کی اداؤں پر ہیں فدا ہر ایک ادا پر دیوانے

اللہ کرے یہ ساقی رہے یہ باقی رہے میخانہ رہے
ساقی کی رہے پر لطف نظر گردش میں ہر ایک پیمانہ رہے
تا دیر جلے یہ شمع ہدیٰ ہونے کو فدا پروانہ رہے!
اور دشت جنوں میں گرم سفر بے تاب دل دیوانہ رہے
ہیں شیخ ہمارے شمع ہدیٰ ہم شمع ہدیٰ کے پروانے
ہم ان کی اداؤں پر فدا ہر ایک ادا پر دیوانے